خصوصی کارڈ

مصنف ۔ تھامس ایڈور

عنوان ۔

ترتیب ۔

مترجم ۔ حسام الدین راشد

ہندوستان ۔ عدد

B/

انقلاب ۱۸۵۷ء

کی

تصویر کا دوسرا رخ

مترجمہ

شیخ حسام الدین

پبلشرز

اردو اکیڈمی لاہور

باردوم فروری ۱۹۳۷ء قیمت ۱۲/

دیباچہ

ستمبر ۱۹۲۷ء کے الہلال میں اس کتاب کے بعض نامکمل اقتباسات شائع ہونے شروع ہوئے تھے، جن کے مطالعہ سے اس کتاب کے دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ لیکن افسوس کہ ایک کافی عرصہ کے انتظار کے باوجود مایوس ہونا پڑا۔ اس اثناء میں اتفاق سے فرصت کا وہ عدیم النظیر زمانہ، جسے عام طور پر اسیری کا زمانہ کہا جاتا ہے، جب اس دفعہ پھر نصیب ہوا، تو جہاں دہلی، سرحد، اور پنجاب کے برگزیدہ اور ممتاز بزرگوں سے نیاز حاصل کرنے کی سعادت نصیب ہوئی، وہاں یہ دیرینہ آرزو بھی پوری ہوئی اور اصل کتاب کا مطالعہ کیا۔ لیکن جب الہلال کے اقتباسات سے مقابلہ کیا تو وہ بالکل نامکمل اور غیر مربوط صورت میں نظر آئے۔ اس کے ساتھ ہی

احباب کا بھی یہی تقاضا تھا کہ اس کا سلیس اور بامحاورہ ترجمہ کتاب کی صورت میں از سرِ نو ہونا چاہیئے۔ چنانچہ مجھے اس خدمت پر مامور کیا گیا۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ بلحاظِ زبان اور ادب کے یہ کتاب اُردو لٹریچر میں کوئی قابلِ قدر اضافہ ہو گی، لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ اس قسم کے مضامین کی اُردو میں منتقل کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ اور یہی وجہ میری اس جسارت کی محرک ہوئی۔ ورنہ جہاں تک زبان و ادب کا تعلق ہے، اپنے آپ کو کسی معنے میں بھی اس کا اہل نہیں سمجھتا۔ کہ اس کٹھن وادی میں قدم رکھ سکوں۔ بہر حال ملک کے لیئے ایک نہائت ہی مفید اور ضروری چیز سمجھ کر اپنے پریشان الفاظ میں منتقل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور اگر ناظرین نے اس کے مطالب سے واقفیت حاصل کرنے کے بعد اپنی گری ہوئی حالت کے بدلنے کے لیئے کوئی حرکت کی تو میں سمجھوں گا۔ کہ میرا مطلب پورا ہو گیا۔

جہانتک اس کتاب کی ترتیب کا تعلق ہے میں نے اپنی طرف سے انتہائی کوشش کی ہے کہ مصنف کی غرض اور کتاب کے مطالب کو پوری طرح ادا کر دوں۔ البتہ میں نے اتنی تبدیلی ضرور کی ہے کہ کتاب کے پہلے باب میں سے صرف ایسے امور کو لے لیا ہے۔ جن کا اصل مضمون کے ساتھ براہ راست تعلق تھا اور ان کو کتاب کے پہلے باب میں دو حصوں میں لکھ دیا ہے۔ مگر باقی باب میں چونکہ انہی فرسودہ مضامین کا اعادہ تھا جن کی رُو سے عام طور پر

ہندوستان میں انگریزوں کی موجودگی کی ضرورت خود ہندوستان کے مفاد کیلئے ضروری سمجھی جاتی ہے، یعنی فرقہ دارانہ مناقشات، یا سرحد دنیپال کے حملوں کا بھوت وغیرہ وغیرہ۔ چونکہ ان تمام مسائل پر مختلف اوقات میں پریس اور پلیٹ فارم سے متعدد دفعہ غیر مبہم اور صاف الفاظ میں جواب دیدیا گیا ہے۔ اس لئے میں نے اس تمام حصے کو غیر ضروری سمجھتے ہوئے نظر انداز کر دیا ہے لیکن باقی کے تینوں حصوں کو اصل ترتیب کے ساتھ نقل کیا ہے۔

جہاں تک کتاب کے مضامین اور مصنف کی رائے کا تعلق ہے، میں اپنی طرف سے کوئی اضافہ کرنا نہیں چاہتا۔ کیونکہ میرے محترم دوست مولانا عبدالرحیم خاں پوپلزئی پشاوری نے نہایت وضاحت اور بلاغت سے مقدمہ میں کتاب کے مضامین پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ جو حقیقت میں اس کتاب کا زیور ہے۔ میں قارئین سے استدعا کرونگا، کہ وہ مقدمہ کے ایک ایک حرف کو بغور پڑھیں۔ جس کے بعد وہ کتاب کے مطالعہ سے قرار واقعی فائدہ حاصل کر سکیں گے۔ میں مولانا موصوف کا بیحد ممنون ہوں، جنہوں نے نہ صرف مقدمہ لکھ کر کتاب کی حیثیت میں چار چاند لگا دیئے ہیں، بلکہ کتاب کی ترتیب اور زبان کی درستی میں بھی مسلسل وقت دے کر قابلِ قدر مشوروں سے سرفراز فرماتے رہے۔ یہاں پر یہ بھی ظاہر کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ متذکرہ صدر صحبتوں میں میرے دوست پنڈت شورت

رنگا ملتانی اور برادرم حکیم محمد سکندر خضر امرتسری بھی برابر شریک رہے اور وقتاً فوقتاً مفید تجاویز سے مشکور فرماتے رہے۔

میں یقیناً ناشکرگذار ہوں گا اگر یہاں پر اپنے محترم بزرگ عالی جناب ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری مدظلہ العالی کی شفقت اور بندہ پروری کا شکریہ ادا نہ کروں۔ بالخصوص اس لئے بھی کہ انہوں نے کتاب کے مسودہ کو پڑھ کر میری بے حد حوصلہ افزائی فرمائی اور اس کی طباعت کی ضرورت پر زور دیا۔ چنانچہ انہی حضرات کی عنائت کا نتیجہ ہے کہ یہ کتاب زیور طبع سے آراستہ ہو کر قارئین کے ہاتھوں میں پہنچتی ہے۔

آخر میں قارئین سے بہر حال درخواست کروں گا کہ وہ زبان اور ادب کی خامیوں کو نظر انداز کر کے کتاب کے مضامین کی طرف توجہ دیں۔

ع گر قبول افتد زہے عزّ و شرف

حسام الدین (شیخ) امرتسری
سپیشل جیل۔ گجرات

مقدّمہ

از مولانا عبدالرحیم خاں پوپلزئی پشاور

تاریخ ہند کا وہ ناتمام صفحہ جو ۱۸۵۷ء کے سُرخ مگر ناکام انقلاب سے رنگین ہوچکا ہے، اور درسِ عبرت کا ایک سبق آموز باب ہمارے سامنے پیش کرچکا ہے۔ اپنی تاریخی اہمیت کے باوجود آجتک دنیا کی حقیقت بین نظروں سے اوجھل رہا۔ ہر ایک شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ کوئی فلسفے کا دقیق مسئلہ نہیں کہ جس کی مُوشگافی کیلئے اصولِ موضوعہ کی تمہید، مقدمات کی ترتیب، دلائل و قیاسات کی تقریب اور نتائج کی تصحیح کیلئے غور و خوض کی ضرورت پڑے، کیونکہ مشاہدات کے متعلق تیقُن اور اطمینان حاصل کرنے کی بنیاد مشاہدہ ہی پر ہوتی ہے، اور مشاہدہ کے لئے عینی شاہد کی ضرورت ہے، فلسفی دلائل و قیاسات یہاں کیا

کام آسکتے ہیں۔

تاریخ دراصل چند واقعات کی صحیح تعبیر و بیان کا نام ہے جو مشاہدہ یا دیگر محسوسات کی کسی صورت میں وقوع پذیر ہو چکے ہوں۔ مثلاً ہم یہ سمجھنا چاہیں کہ آئرلینڈ میں انگریزوں کے مظالم واقعی ہیں یا محض مبالغہ آمیزی سے کام لیا گیا ہے۔ تو اس کے لئے واقعات کا مشاہدہ یا مستند اور عینی شہادتوں کا حاصل کرنا ضروری ہوگا۔ صرف قیاس سے کوئی رائے قائم کر لینا صحیح نہ ہوگا۔

ہاں اس کے فرائض کی انجام دہی کیلئے ضروری ہے کہ مؤرخ دیانتِ عمل، تصحیح روائت، وسعتِ نظر، سلامتئ طبع اور اصابتِ رائے سے بے بہرہ نہ ہو۔ واقعات میں قیاس و رائے کو دخل نہ دے، اور جب کسی واقعہ کے متعلق روایات حاصل کرے تو اُن میں اصل واقعہ اور رائے کی آمیزش کو الگ الگ رکھ کر غور کرے۔ کسی واقعہ کو توڑ مروڑ کر مسخ شدہ شکل میں پیش کرنا اُس کی اصلی وضع و ترتیب کو اُلٹ پلٹ کر دینا، صحیح و ضعیف ہر قسم کی روائت پر اعتبار کر لینا، واقعات کے تمام پہلوؤں پر غور نہ کرنا، مبالغہ آمیزی سے کام لیکر کسی ناپسندیدہ امر کو پست اور پسندیدہ کو بلند کر دکھانا ایک مؤرخ نما عیار کی مخفی خواہشات کی صحیح ترجمانی تو کر سکتا ہے لیکن تاریخی ذمہ داریوں سے اُسی قدر دُور ہے جس قدر کہ تاریکی روشنی سے اور باطل حق سے۔

تاریخ خواہ وہ یورپ میں لکھی گئی ہو یا ایشیاء میں، انگلستان کے

ٹکسال سے نکلی ہو یا ہندوستان کے مطابع سے، اُس وقت تک اعتماد و وثوق کا درجہ حاصل نہیں کر سکتی، جب تک کہ وہ مذکورہ بالا خصوصیات پر مشتمل نہ ہو۔ واقعات کی فرضی و بناوٹی تصویریں جن کا کوئی رُخ بھی مصوّر کی خود غرضانہ دست درازیوں سے بچ نہ سکا ہو، علم التاریخ کے دامن پر ایک سیاہ داغ سے کم حیثیت نہیں رکھتیں یورپ کا موجودہ فنِ تاریخ اگرچہ کسی معقول اصول کا مرہونِ منّت نہیں اور نہ ہی اس میں اصابتِ رائے کی پابندی لازمی سمجھی گئی ہے، وہ قاعدہ وضابطہ کی قیود سے اُسی قدر آزاد ہے۔ جس قدر کہ خود کوئی قاعدہ اور ضابطہ ہو سکتا ہے۔ تحقیق وتنقید کا اسی حد تک دلدادہ ہے جس حد تک کہ آگ پانی کی تاریکی روشنی کی۔ لیکن اس کی مشینری ایسے پرزوں سے بنی ہے کہ جن کی چال ڈھال، وضع وہیئت اگرچہ بہت سی نگاہوں کو اپنی طرف متوجہ کر سکتی ہے۔ مگر یہ دلکش منظر کچھ عرصہ کے بعد ایک سراب سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔ ان چند تمہیدی ارشادات کے بعد ناظرین جب انقلاب ۵۷ء کی انگریزی تاریخ پر نظر ڈالیں گے تو ان کو معلوم ہوگا کہ وہ واقعات کہ جن کی تہ نہ تو اتنی گہری ہے۔ کہ اس تک رسائی ناممکن ہو اور نہ ہی سطح ایسی ناہموار کہ اس پر کوئی رائے قائم نہ کی جا سکے۔ محض مصنفین کی خود غرضانہ عیاریوں کے سبب سے ایسے الجھاؤ سے پیش کیے گئے ہیں کہ جن سے حقیقت کی اصلی تصویر مخفی رہ جاتی ہے۔

ایک سو سے زائد انگریزوں نے اس درد بھری داستان کو افسانو
ناولوں اور تاریخی پیرایوں میں جس مکاری سے پیش کیا ہے وہ نہ صرف
یہ کہ اُن کی گری ہوئی ذہنیت کا مظاہرہ کرتی ہے بلکہ فن تاریخ کے
دامن پر ایک بدنما داغ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس روّیہ سے مقصود
یہ تھا کہ انگریز دنیا میں حق پرست، منصف مزاج، بُردبار، شریف
الطبع، جوانمرد، فیاض، وفادار اور اولوالعزم ثابت ہوں اور ہندوستانی
جاہل، وحشی، شیطان سیرت، ناتربیت یافتہ، غدّار اور باغی ظاہر ہوں،
تاکہ اُن کے دُکھی دل کی پکار کوئی نہ سُنے نہ ہی اُن کی باتوں پر اعتبار
کرے اور نہ ہی ان کے ساتھ کسی قسم کی ہمدردی کا اظہار کرے۔
ان کے اُوپر جس قسم کا جبر و تشدّد کیا جائے۔ اس کی کوئی شنوائی نہ
ہو اور انگریز قوم بے فکر ہو کر ان پر حکومت کرے۔ اپنا رعب و داب،
عظمت و وقار قائم رکھے اور من مانی باتیں اُن سے منوائے، ہندوستان
میں غلامی کی جڑیں مضبوط ہوں اور ہندوستانیوں کی دلی تمنائیں سب
خاک میں مل جائیں، اُن کے جذباتِ آزادی سرد پڑ جائیں۔ لیکن انگریز
قوم کے اس پروپیگنڈے نے جہاں یہ کیا کہ ہندوستان میں انگریزی
راج نہ صرف قائم ہی رہا بلکہ اس کی عمر ستّر (۷۰) سال اور دراز
ہو گئی اور ابھی معلوم نہیں کہ اور کتنا عرصہ تک رہے گی، وہاں بس
ہندوستانیوں کے دلوں میں منافرت و حقارت کے جذبات کو اور
بڑھا دیا۔ حرّیت اور آزادی کے ولولوں کو اور زیادہ تیز کر دیا۔ نتیجہ یہ

ہوا کہ ہندوستان کی سرزمین پر جنگِ آزادی کا ایک ہولناک اور تباہ کُن طوفان پھر سے اُٹھتا ہوا نظر آنے لگا۔ جس سے زمانہ نے ایک مہیب انقلاب کی طرح ڈال دی اور تاریخ ہند کے ناتمام صفحہ پر اتمام و تکمیل کا ضمیمہ شروع کر دیا۔

مسٹر ایڈورڈ ٹامسن نے اسی خطرے کو محسوس کرتے ہوئے انقلاب ۵۷ء پر ایک کتاب The other side of the Medal یعنی "تصویر کا دوسرا رُخ" کے نام سے لکھی۔ جس کے ذریعہ سے اس نے یہ کوشش کی ہے کہ ہندوستانیوں اور انگریزوں کی باہمی منافرت دُور ہو جائے اور انگریزی حکومت اور ہندوستانیوں میں مفاہمت اور دوستی و اعتماد کے روابط اچھی طرح قائم ہو جائیں تاکہ آزادی کے خطرات کا سدِ باب بوجہ احسن ہو جائے۔

اس کتاب کے بعض اہم اقتباسات کا اُردو ترجمہ ۱۹۲۷ء میں الہلال کے دو نمبروں میں شائع ہوا اور اسی کی تمہید میں مکمل ترجمے کا بھی وعدہ کیا گیا تھا۔ مگر تین سال کے یاس انگیز انتظار نے شائقین تاریخ کا پیمانۂ صبر لبریز کر دیا۔ آخر انہوں نے محترم بندہ شیخ حسام الدین صاحب میونسپل کمشنر امرتسر کو مجبور کیا کہ وہ عام فہم اُردو ترجمہ کر کے تاریخ و ادب کی ایک ضروری خدمت کو سرانجام دیں۔

شیخ صاحب کا ترجمہ اِس وقت میرے سامنے ہے اور اسی کے

لحاظ سے میں کتاب کے مضامین پر مختصر روشنی ڈالوں گا۔ ترجمہ میں الفاظ کی ترتیب ۔ تراکیب کی بندش ، اور عبارات کی تہذیب جس خوش اسلوبی اور خوش بیانی کے ساتھ مقاصدِ کتاب اور مرادِ مصنف کو واضح کرتی ہیں۔ وہ قابلِ قدر ہیں۔ بالخصوص بعض شاندار مگر مانوس الفاظ کی حسب موقع ترتیب اور دلکش تراکیب کی تشکیل ، نہ صرف شیخ صاحب کی جودتِ طبع کی شہادت دیتی ہیں بلکہ ترجمہ کی خوبیوں کو بھی دو بالا کر دیتی ہیں۔

ناظرین جب تاریخی معیار سے مضامین کتاب پر نظر ڈالنا چاہیں تو ان کو یہ غور کرنا چاہیئے کہ مفصلہ ذیل امور کے متعلق کہانتک روشنی ڈالی گئی ہے۔ کیونکہ یہی چند امور مصنف کی قابلِ قدر تحقیق اور کتاب کی تاریخی حیثیت پر کافی طور سے روشنی ڈال سکتے ہیں۔ (۱) تصنیف کی غرض و غایت (۲) انقلاب کے اسباب (۳) واقعات کی تحقیق۔ (۴) ناکامی کے اسباب و اثرات (۵) پروپیگنڈا کی تفصیل اور اس کے اثرات۔

۱۔ تصنیف کی غرض و غائت

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اُس وقت مصنف کی دُور بین نگاہوں کے سامنے ہندوستان کے اندر انقلاب کے اُٹھتے ہوئے طوفان نمودار ہو چکے ہیں۔ بحر الکاہل کی پُر سکون سطح میں ایک ہولناک تلاطم پیدا ہو گیا ہے اور قلزم واسود کی زخار موجیں اُٹھ اُٹھ کر انگریزوں کی

پریشان حالی کی طرف اشارہ کر رہی ہیں۔ اس لئے وقت آگیا ہے۔ کہ جلد از جلد اپنی قوم کو اس خطرہ سے آگاہ کر دیا جائے۔ تاکہ حکومت تحکم و استبداد کی پالیسی کو چھوڑ کر نام نہاد اصلاحات کی اسکیموں سے ہندوستان کے اُبھرتے ہوئے جذبات کی آگ کو سرد کر دے۔ جس سے کہ مفاہمت کی بہترین صورت پیدا ہو جائے۔ کیونکہ مصنّف کے نقطۂ نگاہ میں فریقین کے درمیان منافرت اور بے اطمینانی محض اس وجہ سے پیدا ہوئی ہے کہ انگریزوں نے انقلاب ۱۸۵۷ء میں نہ صرف ہندوستانیوں پر وحشیانہ مظالم روا رکھے بلکہ اصلیت کے اخفاء کے ساتھ ساتھ ان کے برخلاف نہایت مکروہ غلط بیانی سے آج تک کام لیا۔ چنانچہ ذیل کا اقتباس مصنّف کی اس غرض کو کافی طور پر واضح کرتا ہے۔

(۱) "اگر ہم نے اس معاملے میں نیک نیتی سے قدم اُٹھایا تو ہم اس سرچشمہ تک پہنچنے میں جو کہ ہمارے خلاف نفرت و حقارت کا زہر پھیلا رہا ہے نہ صرف کامیاب ہوں گے بلکہ اس کی گہرائیوں سے بغض و کینہ کے جذبات کو ہمیشہ کیلئے دُور کر دیں گے۔"

(۲) شمالی ہند ہی وہ خطہ ہے جہاں کہ یہ مدفون آتش فشاں مادہ پھٹنے کے لئے ایک مستقل خطرہ بنا ہوا ہے۔ جس سے کہ تمام ملک کے امن عامہ میں ایک زلزلہ انگن مصیبت کے پھیلنے کا قوی احتمال ہے۔

(۳) "اس وقت ہندوستانی مرد اور عورتیں اپنی خودداری اور قومی

وقار کی واپسی کا مطالبہ کر رہی ہیں۔ ہندوستان کی تاریخ میں ایک نئے انقلاب کے طلوع کا انتظار ہے"۔

(۲) انقلاب کے اسباب

۵۷ء کا انقلاب جن اسباب کی بنا پر ہوا اُن کی رُوداد بہت بڑی تفصیل پر مشتمل ہے۔ ہندوستانیوں کی غرض اِس سے یہ تھی کہ ہندوستان کو انگریزی راج کی بدترین غلامی سے نجات دلا کر اپنی عظمت وقار، آزادی و خودداری کو پھر سے حاصل کیا جائے۔ مگر انگریز اس بات کو چھپاتے ہیں کیونکہ اس سے انہیں ایسٹ انڈیا کمپنی کے نت نئے مظالم، توسیعِ سلطنت کیلئے ریاستوں کا الحاق، ڈلہوزی کی حکمت عملی، حکومت کی بدعہدی اور اسی طرح دوسری مکارانہ غداریوں کے راز کے انکشاف کا یقین ہے۔ مصنف نے جس وجہ سے اس تفصیل میں جانا پسند نہیں کیا۔ ہم اس کو بحث میں لانے کی چنداں ضرورت نہیں سمجھتے۔ البتہ جن الفاظ سے اس موضوع پر اس کے خیالات کی ہلکی ہلکی شعاعیں پڑتی ہیں وہ حسب ذیل ہیں:۔

(۱) " غدر کے اسباب پر بحث کرتے ہوئے "کھوئی ہوئی سلطنت" کا بناوٹی مؤرخ ذیل کے الفاظ میں اپنے جعل و فریب کی اس طرح نمائش کرتا ہے کہ غدر کے متعلق زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ کسی معنی میں بھی قومی بغاوت نہیں تھی۔ سوائے صوبہ اودھ کے جو اس وقت مشکل سے انگریزی مملکت کا حصہ کہا جا سکتا ہے، اودھ جیسے معمولی علاقہ کو مثال

میں پیش کر کے مصنف نے فاش غلطی کی۔ یہ مثال اور کمزور ہو جاتی ہے جب ہم جھانسی اور مرہٹوں کی طرف دیکھتے ہیں جنہوں نے پیشوا کی طاقت کو بحال کرنے کیلئے نانا صاحب کے ماتحت اس بغاوت میں حصہ لیا اور دوسری طرف مسلمانوں نے دہلی کی شہنشاہیت کے قیام کیلئے جدوجہد کی۔"

(۲) "بنگالی مؤرخ بابو رومیش چندر دت لکھتا ہے کہ لارڈ ڈلہوزی کے عہد میں ہندوستان کے بڑے بڑے حصّوں کو یکے بعد دیگرے ایسٹ انڈیا کمپنی کے مقبوضات میں شامل کئے جانے کی وجہ سے ہندوستانیوں کے دلوں میں یہ شکوک پیدا ہوئے کہ کمپنی کا منشا تمام ہندوستان کو فتح کر لینا ہے۔ اس لئے تمام معاہدات کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ بغاوت کے رہنماؤں نے اشتہارات اور اعلانات کے ذریعہ لوگوں کو غیر ملکیوں یعنی انگریزوں کی بد عہدی اور ہوس ملک گیری کی پالیسی کی طرف توجہ دلائی۔"

(۳) نواب معین الدین حسن خاں جو ہمارے معاصرے کے وقت دہلی میں موجود تھے، لکھتے ہیں کہ "ہندوستان میں انگریزوں کی موجودگی ہندوستانیوں کے نزدیک مداخلت بیجا کی حیثیت رکھتی ہے۔ اودھ کو اپنی مملکت میں ملا لینے سے یہ احساس اور زیادہ گہرا ہو گیا۔"

(۴) "جنگِ آزادی کی تحریک کس حد تک مقبول تھی یا صرف فوجی بغاوت کی حیثیت سے رہی جیسا کہ ہمارے مؤرخین بیان کرتے ہیں۔ یہ ایسے سوالات ہیں جن کا حل یقینی طور پر ابھی تک نہیں ہوا۔"

(۵) مسٹر ڈزرائلی وزیر اعظم انگلستان نے ۲۷۔ جولائی ۱۸۵۷ء کو اپنی

تقریر میں کہا کہ "مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ محض فوجی تکلیف کی بنا پر بغاوت نہیں ہوئی بلکہ درپردہ لوگ ملک کی عام سیاسی بے چینی کی حمایت میں اٹھے تھے"!

(۶) چربی والے کارتوسوں کا فوج میں استعمال کرنا بھی ایک سبب بتلایا جاتا ہے۔ لیکن مضامین کتاب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت میں یہ چیز فوجی شورش کی محرک تو ہوئی۔ لیکن عام سیاسی بے چینی اس سے پیدا نہیں ہوئی۔ کیونکہ بہت سے مقامات پر سول آبادی نے اس سے پہلے بغاوت شروع کر دی تھی۔ جیسا کہ آکسفورڈ تاریخ ہند اور دوسری تواریخ میں اس قسم کی بہت سی تصریحات موجود ہیں"!

غرض آزادی کی یہ ایک ایسی جنگ شروع کی گئی تھی کہ جس کا مقصد کسی خاص مذہب یا فرقہ کی آزادی تک محدود نہ تھا۔ بلکہ اس میں تقریباً ہندوستان کے تمام باشندے شریک تھے۔ اور سب کا مشترک مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کو انگریزوں کے پنجہ سے نجات دلائی جائے۔

(۳) واقعات کی تحقیق

تاریخی واقعات کی تفصیل پیش کرنے سے پہلے مورخ کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ ایک غیر جانبدارانہ حیثیت کے ساتھ وثوق و اعتماد کے تمام ذرائع پر غور کرے۔ چنانچہ جہاں تک دیکھا گیا ہے مصنف نے اکثر واقعات کو محققانہ طریق پر نقل کیا ہے، اور انگریزوں کے جبر

واستبداد کا کوئی واقعہ بھی ایسا نہیں لیا جو خود ان کے نزدیک قابل قبول نہ ہو۔

انگریزوں کے برخلاف ہندوستان کے عائد کردہ الزامات کو مصنف نے انہیں کے خطوں اور دستاویزوں سے ثابت کیا ہے اور ان تحریرات کی تائید میں پارلیمنٹ کے ریکارڈ اور حکومت کی محفوظ مسلوں کا حوالہ پیش کیا ہے۔ چونکہ ان شہادتوں کے وثوق پر کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی تو اس لحاظ سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ جن مظالم کی تفصیل اُن کے اندر آچکی ہے اس سے انگریزوں کو کسی طرح انکار نہیں ہو سکتا۔ البتہ جن تحریروں کی براہِ راست حکومت یا اس کے ذمہ دار افراد کی طرف نسبت نہیں کی گئی۔ ان کے ثبوت میں دوسری قابل اعتماد شہادتوں کی ضرورت پڑے گی۔

مثلاً یہ کہ انگریزوں نے "زندہ مسلمانوں کے جسم پر سؤر کی چربی مل کر پھانسی دیا۔ یا زندہ آگ میں جلایا۔ اور ہندوستانیوں کو مجبور کیا۔ کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ بدفعلی کریں"!!

اگرچہ یہ کسی ذمہ دار انگریز کی تحریر سے براہ راست ثابت نہیں لیکن جب مسٹر ڈی لین ایڈیٹر ٹائمز آف انڈیا جیسی معتبر اور مشہور ہستی اپنے ایک آرٹیکل میں اس پر وثوق کا اظہار کر چکی ہے اور حکومت اور اس کے ذمہ دار افراد نے اُس وقت کوئی تردید بھی نہیں کی حالانکہ پریس پر حکومت کا پورا قبضہ تھا۔ نیز اس قسم کے دوسرے واقعات سند

خود ارکانِ حکومت کی تحریروں میں بھی مذکور ہیں۔ یہی وجہ ہے۔ کہ مصنّف بھی اس کو ایک ناقابلِ انکار امر کی حیثیت سے پیش کرتا ہے اور اس لحاظ سے یہ واقعہ تیقّن کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔

ان واقعات کے ذیل میں اس قسم کی مختلف مثالیں ایسی بھی موجود ہیں جن کو مصنّف نے اعتماد و وثوق کے ساتھ نقل تو کر دیا ہے۔ لیکن جن امور پر ان کی صحت و قبولیت کا دار و مدار ہے ان کو بڑی حد تک نظر انداز کر دیا ہے۔ میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ مصنّف کی نظرِ تحقیق اِن واقعات سے کیوں ہٹی رہی حالانکہ اُن کی اہمیت بھی دوسرے واقعات سے کسی طرح کم نہیں۔ اس سلسلہ میں ایک اور اہم واقعہ ہمارے سامنے آ جاتا ہے جس کی تحقیق بھی ایک صحیح اور گہری نظر کی محتاج ہے۔ لیکن اس میں مصنّف نے اس کو جس شکل میں پیش کیا ہے۔ وہ اس کو تاریخی حیثیت سے مشکوک بنا دیتی ہے۔ اپریل ۱۹۱۹ء میں جلیانوالہ باغ کا حادثہ ایسا مخفی نہیں کہ جانبدارانہ اغراض کے ماتحت کسی قطع و بُرید کا متحمل ہو سکے۔ جبر و استبداد کے چنگیزی ہاتھوں نے جس معصوم اور مقدس خون سے پنجاب کی سرزمین پر اس کی داغ بیل ڈالی ہے، وہ دنیا کی کسی مادی و عصبی طاقت کے ذریعہ سے محو نہیں ہو سکتی۔

غدر کے اثرات کے سلسلہ میں اس حادثہ کو لا کر مصنّف نے جس آئینہ سے دکھایا ہے، مجھے خوف ہے کہ وہ کہیں اُس کی جانبدارانہ ترمیم

وتنسیخ کو فاش نہ کر دے۔ کیونکہ اس واقعہ کی تفصیل میں جاکر اس نے جس ڈھنگ سے سفاک ڈائر کے فعل کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے اسباب وعلل کا جو گوشوارہ پیش کیا ہے۔ وہ حق بینی وحق پرستی کے پردوں کو پارہ پارہ کر دیتا ہے، وہ لکھتا ہے کہ:۔

"دوسری طرف جلسے کا انعقاد اس غرض سے عمل میں نہیں لایا گیا تھا کہ وہاں امن وسکون سے کسی متنازعہ فیہ مسئلہ کا حل تلاش کرنا تھا اور نہ ہی وہ غیر مسلح تھے، سوائے اس کے کہ ان کے پاس بندوقیں وغیرہ نہ تھیں۔ عوام اکثر لاٹھیوں سے مسلح تھے"۔

ناظرین سمجھ سکتے ہیں کہ جلیانوالہ باغ کے غیر محفوظ رقبہ میں بغیر اسلحہ کے کثیر التعداد انسانوں کا علی الاعلان اجتماع کرنا اگر اس غرض سے نہیں تھا کہ وہ وہاں باامن رہ کر کسی متنازعہ فیہ مسئلہ کا حل تلاش کریں تو جس مقصد کیلئے یہ انعقاد ہوا اس کی تشریح کیا تھی اور کہاں تک مصنف نے اس کو یقین کے درجہ تک پہنچانے کی کوشش کی۔ صرف یہ کہدینا کہ "جلسے کا انعقاد اس غرض سے نہیں تھا" یا یہ کہ "وہ غیر مسلح نہیں تھے (اس لئے کہ) لاٹھیوں سے مسلح تھے"۔ ایک مدعی یا متدین مورخ کو اس کی ذمہ داریوں سے سبکدوش نہیں کر سکتا۔

اس واقعہ کی تفصیل میں ایک جگہ پر مصنف نے ایک اور چیز ایسی پیش کر دی ہے جو اس کی مخفی جانبداری کو اور زیادہ روشن کر دیتی ہے۔ چنانچہ وہ انگریزوں کے غیظ وغضب کو جائز ومناسب ثابت کرنے

کیلئے ایک وجہ یہ بھی پیش کرتا ہے کہ "ایسے اشتہارات چسپاں کیے گئے جن میں انگریز عورتوں کو بے عزت کرنے کی ترغیب دی گئی تھی" قارئین جانتے ہیں کہ جلیانوالہ باغ کے حادثہ پر غور و خوض کرنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ مصنّف اس کی اہم جزئیات کو ایسی شہادتوں سے فراہم کرتا۔ جن کے اعتماد و وثوق پر کسی سمجھ دار آدمی کو شک و شبہ کی گنجائش باقی نہ رہتی۔ ظاہر ہے کہ اشتعال انگیز اشتہارات کا چسپاں کرنا بذاتہٖ ایسا سنگین واقعہ ہے کہ جس کا ذکر ہنٹر کمیٹی کی نیم سرکاری رپورٹ یا دیگر سرکاری یادداشتوں میں آنا ضروری تھا۔ بالخصوص جبکہ جنرل ڈائر کے غیظ و غضب کو حق بجانب ثابت کرنے کیلئے ایک اہم وجہ ہو سکتی تھی۔ لیکن افسوس کہ مصنّف یہاں بھی حسب معمول دامن بچا کر نکل گیا حالانکہ وہ اس کو ایک مدعیانہ حیثیت سے پیش کرنے میں مطلقاً نہیں جھجکا۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اِن حالات کے ماتحت مصنّف کی دیانت اور انصاف کا دامن کہاں تک پاک و صاف رہ سکتا ہے۔

۴۔ ناکامی کے اسباب

انقلابی واقعات پر غور و خوض کر لینے کے بعد یہ ضروری تھا۔ کہ اس کی ناکامی کے اسباب پر کافی روشنی ڈالی جاتی۔ دراصل ان اسباب کا بیان ہی کتاب کا ایسا اہم باب ہے جس کے بغیر تمام مضامین نہ صرف یہ کہ اُدھورے رہ جاتے ہیں۔ بلکہ تاریخی حیثیت سے بھی گر جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کسی واقعہ کے متعلق چند معلومات حاصل کر لینا، خواہ

کتنا ہی مفید کیوں نہ ہو، اس کی تاریخی حیثیت کو واضح نہیں کر سکتا جب تک کہ اس کے تمام پہلوؤں پر غور وخوض نہ کر لیا جائے۔ مثلاً جنگِ عظیم کا بیان اُسی وقت تاریخی حیثیت پیدا کر سکتا ہے جبکہ اس میں دولِ اتحاد و ائتلاف کی چیرہ دستیوں، ان کی جارحانہ یا مدافعانہ دست درازیوں کے علاوہ جنگ کے اسباب اور فتح و شکست کے وجوہ پر بھی کافی روشنی ڈالی گئی ہو۔ کیونکہ جنگی تواریخ سے محض یہ غرض ہوتی ہے کہ ناظرین اس کے مطالعہ سے قوموں کی فتح و شکست کے راز معلوم کر کے سیاسی و اخلاقی قابلیت کے اُن مدارج پر پہنچ جائیں جن کے ذریعہ سے وہ اپنے تحفظ و بقا کا کافی طور پر انتظام کر سکیں۔ اس سے قوموں کے بننے بگڑنے، اُبھرنے اور گرنے کا راز منکشف ہوتا ہے۔ اور اسی روشنی میں غلام قومیں آزادی کی راہیں تلاش کرتی ہیں اور آزاد قومیں اپنی آزادی کو پنجۂ استعمار سے محفوظ رکھ سکتی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ متذکرہ صدر اسباب کے چھپانے میں غاصب اور متسلط قومیں کسی قسم کی بددیانتی سے بھی دریغ نہیں کرتیں۔ وہ جانتی ہیں کہ تاریخ کا یہ ورق ان کی مکاری و غداری، بددیانتی و بدعہدی، جبر و استبداد، غصب و خیانت اور قتل و غارت کا کچا چٹھا پیش کرتا ہے۔ مصنف کے سابقہ رویہ کو مدنظر رکھ کر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ممکن ہے کہ اس کی نظرِ تحقیق اس باب میں بھی کامیاب نہ ہو سکی ہو۔ کیونکہ اس قسم

کے مخفی اسرار ابھی تک جبر و استبداد کی گھٹا ٹوپ تاریکیوں میں پڑے ہوئے ہیں۔

اس سلسلہ میں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں اُن چیزوں کو بھی واضح کر دوں جن کو عام طور پر ناکامی کے اسباب میں شمار کیا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ اُن کی روشنی میں غور و خوض کر لینے کے بعد اصلی بھید کا سراغ لگ سکے۔ کیونکہ بعض دفعہ آثار و قرائن کے ذیل میں قطعی دلائل کا بھی پتہ چل جاتا ہے۔ بہر حال تحقیقی ذمہ داری سے قطع نظر کر کے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی ناکامی کے اسباب حسب ذیل ہیں:-

(۱) ہندوستانی ریاستوں نے ہندوستانیوں کا ساتھ نہیں دیا۔ (۲) جنگی رقبوں کی عام سول آبادی نے اس میں حصہ نہیں لیا۔ (۳) انگریزوں کے خلاف عام طبقہ میں کوئی پراپیگنڈا نہیں کیا گیا۔ اور نہ ہی عام سطح پر جنگ آزادی کی کوئی تحریک تھی (۴) جدید اسلحہ اور سامانِ جنگ سے ہندوستانی مسلح نہیں تھے۔ (۵) ایسٹ انڈیا کمپنی نے ملک کی دولت پر قبضہ کر کے اس کو کنگال کر دیا تھا۔ (۶) جنگجو ہندوستانیوں کی جماعت میں ایسے با اثر لوگ بھی موجود تھے جو اپنی اغراض کے ماتحت انگریزوں کے ساتھ در پردہ ساز باز کر چکے تھے۔ (۷) ہندوستان کی بری و بحری حدود میں امن تھا۔ اور انگریز مکمل طور پر وہاں قابض تھے۔ صرف پشاور میں دو سو (۲۰۰) فوجیوں

کو بغاوت کے الزام میں سخت سزائیں دی گئی تھیں لیکن اس سے عام سول آبادی میں کوئی خاص اثر پیدا نہیں ہؤا تھا۔ (۸) عام لوگ اس وقت شخصی حکومتوں سے تنگ آ چکے تھے اور ان کے سامنے اس قسم کا کوئی ایسا پروگرام نہیں رکھا گیا تھا۔ جس کی رو سے یہ اطمینان ہوتا کہ انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل کر لینے کے بعد کوئی ایسی حکومت قائم کی جائے گی۔ جو ہندوستان کے مشترکہ مفاد کی محافظت اور عام طبقہ کی صحیح نمائیندگی کر سکے گی۔ (۹) ملک کے اندر پھوٹ اور اختلاف پیدا کرنے کیلئے خطرناک ریشہ دوانیاں کام کر رہی تھیں۔ اس وجہ سے ہندوستانیوں میں فرقہ دارانہ حقوق و مفاد اور فوجی جھگڑوں نے افسوسناک صورتِ حال پیدا کر دی تھی۔ (۱۰) ذرائع نقل و حرکت اور سلسلۂ خبر رسانی پر انگریزوں کا کامل قبضہ تھا اور اس کے ساتھ پریس پر بھی پورا اقتدار تھا (۱۱) اگرچہ یہ کہا جاتا ہے کہ اکیس چھاؤنیاں جنگ کی نذر ہو چکی تھیں۔ مگر وہ اس قدر بکھری ہوئی تھیں کہ ان میں مطلقاً کسی قسم کی باہم شیرازہ بندی نہیں تھی۔ دوسرے سوائے میرٹھ کے کہیں بھی ہندوستانی معقول تعداد میں شریک نہیں تھے۔ اور اگر کہیں تھے بھی تو ان کا مرکزوں کے ساتھ کوئی اتصال نہیں تھا۔ برخلاف اس کے انگریزوں کے مراکز محفوظ اور مربوط تھے۔ (۱۲) ہندوستان میں تازہ دم انگریزی فوج انگلستان سے اس وقت پہنچ چکی تھی جبکہ ہندوستانی فوج کے سربرآوردہ اور

محرک قائدین جنگ میں کام آچکے تھے (۱۳) دولِ خارجہ کے سامنے ہندوستان کی مظلومیت اور جنگ کے حقیقی اغراض کا کوئی خاکہ موجود نہیں تھا۔ بلکہ اس کے برخلاف غلط پروپگنڈے کے ذریعہ سے بغاوت اور سرکشی کا الزام ذہن نشین کرایا گیا تھا۔ (۱۴) نئے نظامِ حکومت قائم کرنے اور ہندوستانیوں کے ملکی و مذہبی مفاد کی حفاظت کرنے کے متعلق حکومت نے خوشنما وعدوں سے حوام کو لٹو بنا دیا تھا۔

اس تفصیل کو سامنے رکھ کر ناظرین حق رکھتے ہیں کہ وہ اس کی ہر ایک دفعہ کو تاریخی معیار سے پرکھیں کیونکہ میں نے ان کو مدعیانہ حیثیت سے پیش نہیں کیا بلکہ عام خیالات کی ترجمانی کی ہے۔ ممکن ہے کہ بعض چیزیں تحقیق و تنقید کی کسوٹی پر پوری نہ اتر سکیں لیکن واقعیت کے امکان سے خالی نہیں ہیں۔

بہر حال مصنف کا یہ ایک اہم فرض تھا جو کسی نامعلوم مصلحت کی بنا پر اس نے نظر انداز کر دیا تھا۔ مگر ہماری اس مختصر تحریر نے اس کمی کو پورا کر دیا۔

۵ - پروپگنڈا کی تفصیل اور اسکے اثرات

پروپگنڈے کی تفصیل اور اس کے اثرات پر جہاں تک مصنف نے روشنی ڈالی ہے، وہ بہت بڑی حد تک قابلِ قدر ہے۔ کسی فریق جماعت کے ممبر سے اس قسم کی غیر جانبدارانہ صاف بیانی کا

ظہور پذیر ہونا۔ اس کی مدبرانہ صلح پسندی کا ایک بیّن ثبوت ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ مصنف نے اپنی قوم کی ہفتاد سالہ غلط بیانی کو بے نقاب کر کے، حق و دیانت کی تصویر کے بعض تاریک گوشوں کو روشن کر دیا ہے۔ اب حق و باطل کے امتیاز میں بھی کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ ناظرین کو چاہیئے کہ وہ جانبدارانہ جذبات سے الگ رہ کر بغور مطالعہ کریں۔ اور فریقین کے ساتھ حالات کو سامنے رکھ کر موجودہ مشکلات کا حل سوچیں۔

جو قوم اپنی گذشتہ غفلتوں اور کمزوریوں کا تدارک نہیں کرتی وہ کسی طرح بھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ ہندوستان کا مستقبل اُسی وقت روشن ہو سکتا ہے کہ ہندوستانی اپنی تباہی کا احساس پیدا کر کے میدانِ عمل میں نکل آئیں۔ اور ملک کی آزادی کے لئے کسی قسم کی قربانی سے بھی دریغ نہ کریں۔ آزادی کی منزل کتنی ہی کٹھن اور راستہ کتنا ہی دشوار گذار کیوں نہ ہو۔ اس کی تمام کلفتیں ایک محبِ وطن کے لئے جان سے زیادہ عزیز اور پیاری ہوتی ہیں۔ زمانہ نے بتلا دیا کہ ابھی ابھی جاں نثارانِ وطن کا ایک قافلہ اسی راہ سے گذرا اور منزل مقصود کو پہنچ گیا۔

راہ آزادی کے اے ہندوستانی مسافر! تو بھی عبرت کی آنکھیں کھول اور دیکھ کہ تیرے سامنے اُن کے نقشِ پا کی شوخیاں ہمت و استقلال، عزیمت و ایثار کی کیا کیا مثالیں پیش کر چکی ہیں، زمانہ نے

تیرے لئے اب ایک جدید اور ہنگامہ خیز دَور کا آغاز کر دیا ہے۔ اس لئے اُٹھ! اور کمر ہمّت باندھ، ذلّت و ادبار کی گہرائیوں سے نکل! اور رفعت و بلندی کے آسمان پر چمک!

آخر میں یہ کہدینا ضروری سمجھتا ہُوں کہ جو کچھ ان مختصر الفاظ میں عرض کیا گیا ہے۔ وُہ دراصل "تصویر کے دوسرے رُخ" پر ایک سرسری نظر کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیونکہ ایک تنگ وقت اور نامناسب حالت میں تحقیق و تنقید کے فرائض کا ادا کرنا بہت حدتک دشوار ہے۔ بااینہمہ جس قدر اصل حقائق کی طرف یہ ناظرین کی توجہ پیدا کر سکتا ہے۔ وُہ بہت بڑی حدتک کافی ہے۔ ان معروضات کے بعد مجھے یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ جہاں مصنّف نے دنیا کے سامنے ہندوستان کی جنگِ آزادی کے متعلق مفید معلومات کا ایک بیش بہا ذخیرہ پیش کر کے بہت سے تاریخی حقائق کا انکشاف کر دیا ہے وہاں یہ بھی اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ محترم شیخ حسام الدین صاحب نے اس کا اُردو ترجمہ کر کے علمی، ادبی، تاریخی اور اخلاقی معلومات میں قابلِ قدر اضافہ کر کے ملک و ملّت کی ایک گراں بہا خدمت سرانجام دی ہے۔ میں نے جہانتک دیکھا ہے، ترجمہ بامحاورہ اور سلیس ہونے کے علاوہ ساتھ ساتھ معنوی خوبیوں سے بھی خالی نہیں۔ بہرحال ہمیں شیخ صاحب کی اس قابل قدر خدمت کا مشکور ہونا چاہیئے۔

پہلا باب

غدر

(۱)

آکسفورڈ میں یہ مثل عام طور پر مشہور ہے کہ اگر کوئی شخص ہندوستان کے متعلق اوّل درجہ کے ایوان میں بھی لیکچر دے تو تمام سامعین یکلخت ایوان خالی کر دیں گے۔ ایک زمانہ تھا کہ انگریزی علماء ہندوستانی علوم و فنون میں دلچسپی لیا کرتے تھے۔ لیکن اب یہ حال ہے کہ ہندوستانی مسائل پر کوئی متوجہ نہیں ہوتا۔ اس تبدیلی کا سبب یہ ہے کہ ہمیں یقین ہو گیا ہے کہ ہندوستانی ہماری حکومت سے تنگ آگئے ہیں اور انہوں نے ہمارے حسنِ انتظام کی کوئی قدر نہیں کی۔ قطع نظر اس کے ہم اب بھی ہندوستان کو اپنے قبضے میں رکھ سکتے ہیں۔ بشرطیکہ ہم کافی قربانی اور خون گرانے کیلئے تیار ہوں۔ لیکن جو شور و غل جلیانوالہ باغ کے قتلِ عام پر ہوا تھا اُس سے تو یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہم

بُری طرح ناکام رہے ہیں کیونکہ ہم پہلے غدر کی طرح دوبارہ خون کی ندی میں تیز کر ہندوستان میں اپنے اجارہ کو فروغ دینا نہیں چاہتے۔ نیز گذشتہ عالمگیر جنگ کے اثرات نے نہ صرف ہمیں بہت حد تک خبردار کر دیا ہے بلکہ تھکا بھی دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بحالاتِ موجودہ ہم تلخی اور نفرت کی مخلوط فضا میں سانس لے رہے ہیں۔

ہندوستانی سول سروس جو ایک زمانہ میں ہمارے ہونہار اور قابل نوجوانوں کے لئے نہایت درجہ جاذبِ توجہ ہوا کرتی تھی موجودہ دور میں ان کے لئے کوئی کشش نہیں رکھتی۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اب نہائت معمولی قابلیت کے نوجوان نہائت ہی کم تعداد میں ہندوستانی ملازمتوں کی طرف رُخ کرتے ہیں۔ لیکن اس تمام غفلت اور انکار کے باوجود آثار و قرائن سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان اپنے معاملات کے حل کے لئے جبراً ہماری توجہ کو اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ اگرچہ ایک طرف آئرلینڈ نے خود اپنی قسمت کے حل کرنے کے حق کو ہم سے جبراً حاصل کر لیا ہے۔ اور شام و عراق کی گتھی ابھی تصفیہ کی منزل تک نہیں پہنچی۔ نیز گو مصر کے معاملے میں ایک حد تک پردہ ڈالنے میں ہم کامیاب بھی ہو گئے ہیں۔ لیکن دوسری طرف ہندوستان کا حال ایک غیر مطمئن کیفیت کے ساتھ ہمارے خلاف تلخی اور نفرت کے احساسات رکھتے ہوئے تکلیف کا موجب بنا ہوا ہے۔ اور باوجودیکہ ہم نے ہندوستان میں باضابطہ حکومت کی طرح ڈالکر

نہائیت فیاضی سے اس کو اور نرم کر دیا ہے لیکن پھر بھی ہماری اس پیشکش کو نفرت کے ساتھ ٹھکرا دیا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانیوں کی پیہم اور مسلسل مخالفانہ سرگرمیوں کی وجہ سے وہاں کی مجالسِ آئین و قوانین ایک نقل سے زیادہ حیثیت اختیار نہ کر سکیں۔ یعنی ملک کے منتخب شدہ نمائندگان نے سالانہ آمد و خرچ کے میزانیہ کو مسترد کر دیا۔ جس کی منظوری گورنروں اور وائسرائے کے خاص اختیارات سے لینی پڑی۔ اندریں حالات ہم اس نتیجہ پر پہنچنے سے باز نہیں رہ سکتے کہ یہ مصیبت یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی۔ بلکہ یہ اُس بڑی جدوجہد کا ابھی آغاز ہے۔ چنانچہ موجودہ وقت میں ہندوستانی اژدھے سے محفوظ رہنے کیلئے انگلستان خواہ کتنی ہی بیزاری اور پریشانی کا اظہار کرے۔ یہ ناممکن ہے کہ وُہ اس کی دستبرد سے ہمیشہ علیحدہ رہ سکے۔ کیونکہ یہ بالکل صاف طور پر ظاہر ہے کہ اب اس نے حرکت کرنی شروع کر دی ہے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ مستقبل قریب میں دونوں اپنے اپنے راستوں پر چلتے ہوئے یقیناً ایک مقامِ اتصال پر باہم ملیں گے۔

(۲)

انگلستان کا ہندوستانی معاملات پر عدم توجہ کا اظہار کرنا کوئی نئی بات نہیں بلکہ یہ تو مدت سے زبان زد خلائق ہے۔ چنانچہ دارالعوام کے ہندوستانی مباحث کے خلاف ہندوستانی نہائیت وحشیانہ شدت

سے اظہار رائے کرتے رہے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اکثر یہ کہا کرتے ہیں کہ ایسے مباحث میں ممبران کی اکثریت تو سرے سے متنفر ہی ہ ہے لیکن جو چند ممبران شریک بھی ہوتے ہیں تو وہ بھی پرلے درجے کی لاپروائی کا اظہار کیا کرتے ہیں۔ چنانچہ دو سال ہوئے کہ ایک بیس سالہ پرانے ممبر پارلیمنٹ نے میرے ایک دوست سے دریافت کی کہ اس شخص کا کیا حال ہے جو ہمیں اکثر بہت تکلیف دیا کرتا تھا جس کو "گانڈر" - "گانڈی" یا ایسے کسی نام سے پکارتے ہیں۔ کیونکہ اب اس کے متعلق کوئی ذکر نہیں آتا۔ اس کے یہ معنے ہیں کہ باو اس امر کے کہ سوال کنندہ پریوی کونسلر کے ممتاز عہدے پر فائز لیکن وہ اس حد تک لاعلم ہے کہ وہ اتنا بھی نہیں جانتا کہ اس زمانے کا نہایت ہی ممتاز انسان جو ہندوستانیوں کے نزدیک تما مجالس وضع آئین وقوانین کے مقابلہ میں اکیلا تمام ملک کی نمائند کا حق رکھتا ہے۔ ایک غیر ملکی عدالت کے حکم سے جیل میں بند کر گیا ہے۔

ہندوستان سے ہماری لاپروائی کی پالیسی کے ثبوت میں بھی نہا زبردست دلائل موجود ہیں۔ جو اگرچہ ہندوستانیوں کیلئے ایک مع کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مگر ہم انہیں آسانی سے بیان کر سکتے ہیں چنانچہ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے کبھی بھی ہندوستان کو اپنا کر نہیں رک جس کی تفصیل یہ ہے کہ شروع میں تو یہ خالصتہً تاجروں کی ایک ک

کی جولانگاہ تھا جو اپنے تجارتی مفاد کیلئے اس کے انتظام وغیرہ کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ یعنی چند خاندانوں میں یکے بعد دیگرے سول یا فوجی افسران کے ذریعہ یہاں پر حکومت کی جاتی تھی۔ مگر برطانیہ کے وسیع متوسط طبقہ کیلئے ہندوستانی معاملات میں اس سے زیادہ اور کوئی دلچسپی نہ تھی کہ وہ چند پادریوں یا بہت سے تجارت پیشہ اصحاب کو یہاں بھیج دیتے تھے جو زیادہ تر کلکتہ، بمبئی یا مدراس وغیرہ بڑے بڑے شہروں میں تجارت ۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔

۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ کی کوٹھیاں کھول کر دولت اکٹھی کیا کرتے تھے۔

لیکن موجودہ زمانے میں اس بے تعلقی اور لاپرواہی نے ہندوستانیوں کے دلوں میں ہمارے خلاف غصے اور نفرت کے جذبات پیدا کر دیئے ہیں اور دوسری طرف ہم بھی ہندوستان کے معاملات سے برداشتہ خاطر ہو گئے ہیں چنانچہ ایک یونیورسٹی کے مشہور پروفیسر نے ہندوستان کے متعلق اظہار رائے کرتے ہوئے مجھ سے کہا تھا کہ اس تمام معاملے پر غور کرنے سے میں تو اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ہم نے ہندوستان کے لئے وہ تمام مفید ترین کام جو ایک ملک دوسرے ملک کے لئے کر سکتا ہے کر دیئے ہیں۔ لیکن ہندوستانیوں نے ان کو نہایت ناشکری سے قبول کیا ہے مگر اس کے مقابلے میں ہندوستان میں ہمارے خلاف نفرت کے جذبات نہایت سرعت سے ترقی کر رہے ہیں۔ ج۔ ب

کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ کہ ملک میں قحط اور افلاس روز افزوں ترقی کر رہا ہے جس سے انتہا پسند سیاستدان طبقہ فائدہ اُٹھا کر ملک میں ایجی ٹیشن برپا کر رہا ہے۔ لیکن دوسری طرف کسان اپنی بیچارگی اور غربت کی وجہ سے حکومت کے دست نگر ہیں۔ جس سے معاملات اس حد تک پیچیدگی اختیار نہیں کر سکتے۔ چنانچہ رابندر ناتھ ٹیگور نے مجھے ایک دفعہ کہا کہ ہم ہندوستانی ایک نیم گرسنہ قوم ہیں اور ہماری خوراک ہیں جو صرف چاولوں اور ترکاری تک محدود ہے۔ غذائیت بالکل مفقود ہے جس کے صاف طور پہ یہ معنے ہیں کہ محض زندہ رہنے کیلئے عنقریب ایک بہت بڑی جدوجہد شروع ہونے والی ہے جیسی کہ ہمارے اپنے ملک میں بھی موجود ہے۔ اندریں حالات حکومت روکنے کیلئے خواہ کتنی بھی سر توڑ کوشش کیوں نہ کرے۔ لیکن ناممکن ہے۔ کہ مفلس اور فلاکت زدہ عوام میں بے اطمینانی کے بڑھتے ہوئے جذبات کو فرو کر سکے۔ چنانچہ صورت حالات کی اس نزاکت کو ہندوستانی انتہا پسند طبقہ نے بخوبی سمجھ لیا ہے اور آئے دن کے سیلاب اور قحط کی وارداتوں سے وہ ہر وقت حسب منشاء فائدہ اُٹھانے کے لئے بیتاب نظر آتا ہے۔ دوسری طرف ہمارا تعلیمی نصاب اس حد تک بے نتیجہ اور مایوس کن ہے کہ وہ بھی حالات کے خراب کرنے میں بہت بڑی امداد بن رہا ہے۔ لیکن یہ تمام اسباب نفرت کے اصلی جراثیم کو ظاہر نہیں کرتے جو اس وقت ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلے

ہوئے ہیں اور اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ برطانوی نام کے خلاف مستقل اور ٹھوس نفرت کا جذبہ کارفرما ہے۔ جس کے اسباب کی جستجو کیلئے جسقدر بھی جلد ہم کوشش کریں اُتنا ہی بہتر ہوگا۔ کیونکہ نفرت اور کشیدگی کی خلیج دن بدن وسیع ہو رہی ہے جس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ دماغ میں مشہور واقعات اور مظالم کی یاد زندہ ہے جس کی بنا پر ہمارے خلاف نفرت وحقارت کے جذبات میں بھی نہایت سُرعت کے ساتھ ترقی ہو رہی ہے۔ میرا خیال ہے کہ میری طرح اور بھی بہت سے ایسے انگریز ہوں گے۔ جن کو ہندوستان میں یہی کیفیت نظر آئی ہو۔ اور وُہ بھی نہایت دیانتداری سے اس کشیدگی یا صحیح تر الفاظ میں ہم سے علیحدگی اختیار کر لینے کی تحریک کے اصل اسباب اور وجوہ کی تلاش میں سرگرداں رہے ہوں۔ اور اگرچہ اپنے زُعم میں وُہ اصل نتیجے تک پہنچنے سے ایک حد تک مطمئن ہو گئے ہوں۔ لیکن دراصل انہوں نے بھی مغالطہ ہی کھایا۔ کیونکہ جس چیز کو انہوں نے ایک ٹھوس اور مضبوط دیوار سمجھا تھا۔ وُہ درحقیقت ایک پردہ تھا۔ جس کے نقش ونگار سے دیوار کا مغالطہ ہُوا۔

(۳)

مصالحت کا فقدان نہاںخانۂ دماغ کے کسی گوشے میں ایسا مخفی ہوتا ہے کہ جس تک رسائی محال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قوموں کی باہمی آویزش کبھی ایسا رنگ اختیار کر لیتی ہے کہ وہ باوجود ایک الگ اور جُداگانہ ماحول رکھنے کے بھی ایک دوسرے کے ساتھ دست وگریباں ہو جاتی ہیں لیکن

بجائے اس کے کہ وہ ایک دوسرے کی ہستی کو دنیا سے مٹاکر اپنی ہوس خودداری کو پورا کریں۔ خود اپنی قوت ایک بہت بڑی حد تک زائل کردیتی ہیں۔ اس کی مثال بعینہٖ ایسی ہے جیسے شیر و نہنگ کی مشہور چپقلش جو کہ ایک دوسرے کے درپے ہوکر ہوا اور امواج پر حملہ کر دیتے ہیں۔ مگر اس تاخت و تاراج کی ناکام کوشش سے سوائے اس کے کہ اپنی قوت کا ستیاناس کردیں اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

اندریں حالات یہ ناممکن ہوتا ہے کہ اس قسم کے مستور اور پوشیدہ اسباب تک رسائی حاصل کرکے مصائب و مظالم کے رِستے ہوئے ناسور کے اندمال کی کوشش کی جاسکے خصوصاً جبکہ ایک فریق اس نتیجہ پر پہنچا ہو کہ وہ پیہم اور مسلسل ناانصافیوں اور زیادتیوں کا شکار بنایا گیا ہے۔ اور دوسری طرف فریقِ ثانی نے واقعات کی نشر و اشاعت اپنے مفاد کے مطابق دنیا میں اس حد تک کی ہو کہ وہ مبالغہ آمیزی میں کامیاب رہے۔ چونکہ تاریخ اور پریس دونوں پر اس کا قبضہ تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تلخی اندر ہی اندر اس حد تک مسموم اور زہریلی شکل اختیار کرلیتی ہے جو احاطۂ بیان سے باہر ہے۔ انگریز اپنی طاقت کے باوجود مذکورہ ناانصافی کے اس حد تک خوگر ہوچکے ہیں۔ کہ ہندوستان کے متعلق اُن سے کسی ہمدردی کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ آئرلینڈ، جنوبی افریقہ اور ریاستہائے متحدہ امریکہ کے ساتھ ہمارا سلوک اُس زمانہ میں جبکہ یہ ممالک ہماری نوآبادیاں تھیں۔ اگرچہ کسی قدر خراب ضرور تھا۔ لیکن اتنا

سفاکانہ اور غیر منصفانہ نہیں تھا۔ جتنا کہ دنیا خیال کرتی ہے۔ آئرلینڈ والو
نے دل کھول کر امریکہ میں ہمارے خلاف پروپیگنڈا کیا کیونکہ ہماری مملکت میں
کھلے طور پر اس قسم کے اظہار خیال کرنے میں رکاوٹیں تھیں۔ چنانچہ آئرش
مفرّین نے ملک کی محبت کے نام پر پورے زور شور سے نہایت کامیابی
کے ساتھ لوگوں کو ہمارے خلاف بھڑکایا۔ جنوبی افریقہ کی بوئر قوم نے بھی
برّاعظم یورپ میں ہمارے خلاف کثرت سے جھوٹ کی اشاعت کی۔ اہل
امریکہ نے بھی محض معمولی وجوہات کی بنا پر واقعات کو مبالغہ آمیزی کا
رنگ دیا۔ میں یہاں پر کسی سخت جملہ کے استعمال سے احتراز کرتا ہوں
اس لئے کہ وہ خود ہی اب فراخ دلی کے ساتھ واقعات کا حقیقی انکشاف
کر رہے ہیں۔ چنانچہ دنیا کے سامنے یہ حقیقت اب واضح ہو رہی ہے
کہ کیوں ہم کو ایک نہایت ہی غیر ضروری جنگ میں ایسے وقت میں اُلجھا
گیا جبکہ ہم اپنی سلطنت کے بقا و تحفظ کے لئے نپولین (Nepoleon
جیسے قوی دشمن سے برسرپیکار تھے۔ تاریخ کو نہایت فیاضی کے ساتھ
دوبارہ لکھا جارہا ہے جس سے ہمیں کافی نفع مترتب ہو رہا ہے۔ یعنی
اب دنیا کے سامنے یہ حقیقت ظاہر ہو رہی ہے کہ صرف انگریز قوم ہی ہمیشہ
منافق یا خونخوار نہیں رہی بلکہ تحمّل اور بردباری سے ہم نے اس تمام
مفتریانہ پراپیگنڈا کو برداشت کیا ہے۔ اسی سے ہی ہماری صداقت
دنیا پر آشکارا ہو رہی ہے۔ لیکن کیا تاریخ کے صفحات ایسے واقعات
سے لبریز نہیں جن کی نشر و اشاعت میں مبالغہ آمیزی سے کام لیا گیا ہو

اب جبکہ امریکن مورّخین کی فیاضی سے ہمارے خلاف بدنامی اور تہمت تراشی کے گھناؤنے بادل چھٹ رہے ہیں تو کیا ہم پر یہ فرض عائد نہیں ہوتا کہ ہم بھی ہندوستان کے معاملات میں ویسی ہی فراخدلی کا ثبوت دیں۔ مجھے یقین واثق ہے کہ اگر اس معاملہ میں ہم نے نیک نیتی کے ساتھ قدم اٹھایا تو ہم اُس سرچشمہ تک پہنچنے میں جو آج نہایت تیزی کیساتھ ہمارے خلاف نفرت کا زہر پھیلا رہا ہے، نہ صرف کامیاب ہوں گے بلکہ ہم اُس کی گہرائیوں سے بُغض اور کینے کے جذبات کو ہمیشہ کے لئے فنا کر دینگے۔

ہندوستانی مورّخ نہیں کیونکہ غیر جانبدارانہ تنقید کی قابلیت اُن میں نہیں ہوتی۔ اُن کی نہائت ہی مفید کتابیں تحقیق و علم کی بُہتات کے باوجود پڑھنے والے کی طبیعت کو اُلٹا پریشان کر دیتی ہیں۔ جس کی غالب وجہ یہ ہے کہ کتاب کا بیشتر حصہ کثرتِ تکرار اور غیر ضروری تشریح کی نذر ہو جاتا ہے۔ اور تنقیدی قابلیت کی کمی کی وجہ سے کتاب کا وہ اثر نہیں رہتا۔ چنانچہ ہندوستانی مورّخین سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی، کہ وہ ہمارے تعلقات اور سلوک کی جملہ کیفیتوں پر الگ الگ بحث کر سکیں کیونکہ وُہ اپنی معلومات اور تحقیقات کو مرغوب طریق سے ترتیب دینے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے۔ بنابریں جب وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہم نے ایک نہائت ہی ضروری اور اہم واقعہ کی نشر و اشاعت ارادۃً غلط طور پر کی ہے۔ جو نہایت ہی نامناسب ہے اور یہ کہ اس کی تلافی سے وہ صحیح واقعات کی نشر و اشاعت میں ناکام رہ چکے ہیں تو

اس کا نتیجہ لازمی طور پر یہی ہوگا کہ ان کے دلوں میں ہمارے برخلاف بغض وعداوت کے جراثیم جڑ پکڑ جائیں گے۔

(۴)

ہندوستان میں آکسفورڈ تاریخ ہند (Oxford History of India) کی اتنی شدید مخالفت کیوں کی گئی؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ غدر کے رنجدہ واقعات پر اظہار خیال کرتے ہوئے فاضل مصنف نے کسی قدر سرد مہری اور بے اعتنائی کا ثبوت دیا ہے لیکن بذاتہ وہ ایک ایماندار اور منصف مزاج انسان ہے اور ہندوستان کا سچا بہی خواہ۔ کتاب کی تصنیف میں اسناد سے پوری تحقیقات اور غور و فکر سے کام لیا گیا ہے اور نہائت ہی متناسب طریق سے واقعات کی جانچ پڑتال کی ہے۔ یہ ایک ایسا وصف ہے جس کے حصول کے لئے ہندوستانیوں میں ابھی ضروری صبر اور غیر جانبدارانہ قابلیت کی ضرورت ہے باایں ہمہ مصنف کی ان خوبیوں کو نظر انداز کرکے داستانِ غدر کے طرزِ بیان میں ہندوستانیوں نے ایک خاص تلخی محسوس کی ہے۔ اور مصنف کی سرد مہری اور لاپروائی کے خلاف ویسی ہی نفرت کا اظہار کیا گیا ہے۔ جس طرح اُن مصنفین کے خلاف کیا گیا تھا۔ جنہوں نے غلط بیانی سے کام لیا تھا۔ ایک ایسی مفید کتاب اس سے بھی کہیں زیادہ مفید اور قیمتی دستاویز بن جاتی۔ اگر انداز بیان میں تھوڑی سی گرمی اور فراخدلی کا اور اضافہ کردیا جاتا جس سے یہ بخوبی ظاہر ہوتا کہ مصنف کا مقصد صرف واقعات کی تصیح اور سچائی

کو بے نقاب کرنا ہی نہیں بلکہ گذشتہ صدمات کا ازالہ بھی ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ اِس کتاب میں مذکورہ گرمی اور فراخدلی عنقا ہے۔ مزید براں یہ کتاب چونکہ آکسفورڈ کی سرکاری درسگاہ سے شائع ہوئی ہے۔ اس لئے اس کے مخصوص طرزِ بیان کو ہندوستانیوں نے ایک ناقابلِ برداشت بوجھ کی طرح محسوس کیا ہے جو معلوم نہیں ابھی اور کتنے عرصہ تک اسی طرح تکلیف دہ رہے گا۔

سرزمین ہند میں انگریزوں اور ہندوستانیوں کے متعلق جو نقش قارئین (فرنگی اقوام) نے اپنے دماغوں پر بٹھایا ہے وہ اُسے بھُولے نہیں ہوں گے۔ ہمارے مورخین اور افسانہ نگاروں نے اِس موضوع پر نہایت واضح طور سے ایک خاص قسم کا پراپیگنڈا کیا ہے۔ چنانچہ عام طور پر ایک ہندوستانی کی سیرت کا نقشہ ذیل کے الفاظ میں کھینچا ہے۔ "نیم شیطان اور نیم بچہ۔ ناتربیت یافتہ۔ قانع۔ کُتّے کی طرح وفادار اور اطاعت شعار۔ تصوّف کا شیدائی اور خیالستان میں محو۔ لیکن ان اعلیٰ صفات کے ساتھ اُس میں ایک دغاباز باغی اور ایک خونخوار مذہبی دیوانہ بننے کی صلاحیت بھی موجود ہے۔" بمقابلہ اس کے ایک انگریز کی سیرت کا فوٹو اس طرح پیش کیا جاتا ہے۔ "متین، قابل، انصاف کی ایک نہ ٹلنے والی چٹان۔ اور ہر ایک کے ساتھ اُس کی حیثیت کے مطابق سلوک کرنے والا۔"

اس قسم کی بے بنیاد اور مذموم سیرت نگاری کے خلاف اگر ہندوستانی

نفرت کا اظہار کریں۔ یا کپلنگ (Kipling) جیسے مشہور برطانوی ناول نویس کے نہایت ہی بلند پایہ افسانوں کو پڑھتے وقت تکلیف اور بے عزتی کے جذبات ہندوستانی قلوب کے اندر پیدا ہوں تو یہ کوئی تعجب اور حیرت کی بات نہ ہوگی۔ متعدد ایسے واقعات کو جنہیں ہمارے مورخین نے اپنے رنگ میں بیان کیا ہے۔ ہندوستانیوں نے نہ صرف اُن کی صحت سے ہی انکار کیا ہے بلکہ انہیں غلط ثابت کرنے کے لیئے ہمیں بہ بانگِ دُہل چیلنج بھی کیا ہے۔ بایںہمہ اُن کا اس ایک واقعہ (غدر ۱۸۵۷ء) کے متعلق خاموشی اختیار کرنا محض اس بنا پر ہو سکتا ہے کہ اس کو گذرے ہوئے کچھ زیادہ مدت نہیں ہوئی۔ اور فریقین کے دلوں میں اس کی تلخ یاد ابھی تک تازہ ہے۔ نیز اس وجہ سے بھی کہ اِن واقعات کے متعلق انگریزوں کا نقطۂ نظر اُن کے عالمگیر پراپیگنڈا کے زیر اثر نہایت مضبوطی سے جم چکا ہے۔ جو آسانی سے تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ بدقسمتی سے اس حادثہ میں ہم ایک بڑے پیمانے پر ظالمانہ ناانصافی کے مجرم بنے ہیں۔ اگر ہماری یہ خواہش ہے کہ فریقین کے دلوں سے ایک دوسرے کے خلاف تلخی کے جذبات مٹ جائیں تو ہمیں لازماً اس حادثۂ فاجعہ یعنی غدر ۵۷ء کے متعلق اپنے خیالات کو بدلنا ہوگا۔ جنوبی ہندوستان مشکل سے غدر سے متاثر ہوا اور اب بھی اُس کے خیالات پر اس تلخ یاد کا کوئی گہرا اثر باقی نہیں۔ گو اس ایک امر کے علاوہ اور بھی بہت

سے اسباب ہیں ۔ جن کی رو سے جنوبی ہند میں اس حد تک نسلی منافرت اور عام بے اطمینانی کے جذبات اثر پذیر نہیں ہو سکے جتنے شمالی ہند میں موجود ہیں ۔ مگر شمالی ہند ہی وُہ خطہ ہے جہاں کہ یہ مدفون آتش فشاں مادہ پھٹنے کے لئے ایک مستقل خطرہ بنا ہوا ہے جس سے کہ تمام ملک کے امنِ عامہ میں ایک زلزلہ فگن مصیبت کے پھیلنے کا قوی احتمال ہے ۔ بہت سے ہندوستانیوں کے دماغ میں کسی انگریز سے مخاطب ہوتے وقت غدر کے مصائب کا خیال ایک ایسے بھوت کی طرح مسلط رہتا ہے جس نے اپنا بدلہ نہ لیا ہو ، اور جس کی تمنائیں تاحال پوری نہ ہو چکی ہوں ۔

(۵)

غدر کے اسباب پر بحث کرتے ہوئے " کھوئی ہوئی سلطنت " (The Lost Dominion) کتاب کا بناوٹی مورّخ ذیل کے الفاظ میں اپنے جعل و فریب کی اس طرح نمائش کرتا ہے کہ :-

" غدر کے متعلق زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وُہ کسی معنے میں بھی قومی بغاوت نہیں تھی ۔ سوائے صوبہ اَودھ کے جو اُس وقت مشکل سے انگریزی مملکت کا حصہ کہا جا سکتا تھا ۔ ؎ "

اودھ جیسے معمولی علاقہ کو مثال کے طور پر پیش کر کے اس کتاب کے مصنف نے ایسی فاش غلطی کی ہے جو کسی معمولی مورخ سے بھی کبھی

؎ P. 47. By AL Corthill

نہ ہوتی۔ یہ مثال اور کمزور ہو جاتی ہے جب ہم جھانسی اور مرہٹوں کی طرف دیکھتے ہیں جنہوں نے پیشوا کی طاقت کو بحال کرنے کیلئے ناناصاحب کے ماتحت اس بغاوت میں حصہ لیا۔ اور دوسری طرف مسلمانوں نے دہلی کی شہنشاہیت کے دوبارہ قیام کیلئے جدوجہد کی۔ چنانچہ آکسفورڈ تاریخ ہند میں لکھا ہے کہ:۔

"غدر اگرچہ بادی النظر میں بنگالی دستہ کی ایک فوجی بغاوت تھی۔ جو چربی والے کارتوسوں کے استعمال سے بھڑکی۔ لیکن آخرکار یہ صرف فوج تک محدود نہیں رہی۔ سول رعایا میں بھی بہت حد تک بےچینی اور بے اطمینانی کے جذبات موجود تھے۔ چنانچہ بہت سے مقامات پر فوجی سپاہیوں کی بغاوت سے پہلے وہاں کی سول آبادی نے بغاوت شروع کردی"۔ [1]

بنگالی مورخ بابو رومیش چندر دت لکھتا ہے کہ:۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ ابتدا میں شمالی اور وسطی ہندوستان کی فوج میں بغاوت شروع ہوئی۔ لیکن بعض سیاسی اسباب کی وجہ سے اُس نے وہاں کی بڑی بڑی جماعتوں میں پھیل کر ایک عام سیاسی بغاوت کی شکل اختیار کرلی۔ لارڈ ڈلہوزی کے عہد میں ہندوستان کے بڑے بڑے حصوں کو یکے بعد دیگرے ایسٹ انڈیا کمپنی کے مقبوضات میں شامل کئے جانے کی وجہ سے ہندوستانیوں

---

[1] P. 722 By Alcorthill

کے دلوں میں یہ شکوک پیدا ہوئے کہ کمپنی کا منشا در اصل تمام ہندوستان کو فتح کر لینا ہے۔ اس لئے اس مقصد کے زیر اثر کمپنی نے تمام معاہدات کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ لوگوں میں عام بے چینی تو موجود ہی تھی۔ جس سے بغاوت کے رہنماؤں نے فائدہ اٹھا کر اشتہارات اور اعلانات کے ذریعہ لوگوں کو غیر ملکیوں یعنی انگریزوں کی بدعہدی اور ہوس ملک گیری کی پالیسی کی طرف توجہ دلائی "[1]

نواب معین الدین حسن خان جو ہمارے محاصرے کے وقت دہلی میں موجود تھے، لکھتے ہیں کہ:۔

"میں اپنے قصے کو اس بیان سے شروع کروں گا کہ ہندوستان میں انگریزوں کی موجودگی ہندوستانیوں کے نزدیک مداخلت بیجا کی حیثیت رکھتی ہے اور اودھ کو اپنی مملکت میں ملا لینے کے بعد یہ احساس اور زیادہ گہرا اور شدید ہو گیا۔ ہندوستانی فوج کی بغاوت کے جو اسباب انگریز مورخین نے بیان کئے ہیں۔ انگریز قوم اُن سے بخوبی واقف ہے لیکن ہندوستانیوں کے خیالات اس معاملہ میں ان سے بہت بڑی حد تک مختلف ہیں "[2]

مسٹر ڈزرائلی (Disraeli) وزیر اعظم انگلستان نے ۲۷، جولائی ۵۷ء کو اپنی تقریر کے دوران میں فرمایا:۔

---

[1] India in the Victorian age, P. 223.

[2] The Indian narrative of the mutiny by C.T. Metcalfe, P. 31, 32.

"مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ بنگالی دستہ کے باغیوں نے محض فوجی تکلیفات کی بنا پر بغاوت نہیں کی بلکہ در پردہ وہ ملک کی عام سیاسی بے چینی کی حمایت میں اٹھے تھے۔ دوسری قوموں کے جذبات کا احترام کرنا ہماری حکومت کا ہمیشہ سے اصول رہا ہے جس کو گورنمنٹ ہند نے گذشتہ چند سالوں سے بالکل خیرباد کہہ دیا ہے۔ چنانچہ اس کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ ملک کی تقریباً تمام مقتدر جماعتیں اپنے آپ کو خطرہ میں محسوس کر رہی ہیں" ؎۱

جنگِ آزادی کی یہ تحریک کس حد تک مقبول تھی یا صرف ایک فوجی بغاوت کی حیثیت سے شروع ہوئی تھی جیسا کہ ہمارے مورخین نے ہمیشہ بیان کیا ہے۔ یہ ایسے سوالات ہیں جن کا حل یقینی طور پر ابھی تک نہیں ہوا۔ البتہ حیرت تو اس امر کی ہے کہ اس قسم کی غیر معمولی اہمیت رکھنے والا حادثہ آج تک نہ صرف غیر جانبدارانہ تحقیقات کا شرمندہ رہا ہے بلکہ بالکل یکطرفہ بیانات کو ہی اصل اور صحیح سمجھا گیا ہے۔

دوسرا بڑا سبب جس سے بغاوت کی آگ فی الفور بھڑک اٹھی۔ جیسا کہ ہر ایک کو معلوم ہے۔ چربی والے کارتوسوں کا قضیہ ہے۔ اخلاقی تنزل (گراوٹ) کی اس سے بڑھ کر مکروہ مثال اور کہیں نہیں مل سکتی۔ چنانچہ مورخ لی کے (LEEKY) لکھتا ہے کہ :-

"کانپور کا خوفناک ہنگامہ جو اگرچہ ایک آدمی کے باعث وقوع پذیر

؎۱ The life of Benjamin Dissralli by G.R, Buckle CH IV P. 88.

ہوا۔ انگریزی قوم کے دماغ پر اس حد تک اثر انداز ہوا کہ نہ اس کے متعلق متانت اور سنجیدگی سے کوئی فیصلہ نہ کر سکی۔ اور ایک ایسی لڑائی جس میں کہ فریقین نے ایک دوسرے پر ذرہ برابر بھی رحم روا نہیں رکھا۔ فطرۃً ایک انتہا درجہ کی بربریت اور وحشت کا مظاہرہ ہے۔ انگریز مورخین اگر غور سے اس واقعہ پر نظر ثانی کریں تو ان کو نہائیت ندامت اور شرمندگی سے یہ تسلیم کرنا پڑے گا۔ کہ اگر کسی بغاوت کیلئے کوئی جائز وجہ کا امکان ہو سکتا ہے۔ تو موجودہ حادثہ میں اس سے بدرجہا زیادہ مضبوط اور قوی وجہ ہندوستانی سپاہیوں کیلئے موجود تھی" ۱؎

لارڈ رابرٹس (ROBERTS) مسٹر اینسن (ANSON) کی ایک چٹھی کا اقتباس پیش کرتے ہیں۔ جو اس نے غدر کے ایام میں بہ حیثیت سپہ سالار لارڈ کیننگ (CANNING) وائسرائے ہند کو لکھی تھی:۔

"کارتوسوں کا معائنہ کرنے کے بعد مجھے سپاہیوں کے اعتراضات پر مطلقاً کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ مجھے ہرگز یہ خیال نہ تھا کہ کارتوسوں میں ایسی چکنی چیز کا استعمال کیا جائے گا۔ جو بالکل چربی ہے۔ گولی کے دبانے کے بعد بندوق کے منہ کی جالی اسی چربی سے ڈھکی ہوئی ہوتی ہے" ۲؎

۱؎ The map of life 1921 Edition, P. 104.

۲؎ Forty one years in India, P. 94.

اس کے بعد اپنی رائے کو ذیل کے الفاظ میں ظاہر کرتا ہے کہ :۔

"میری رائے میں ان کارتوسوں کے استعمال سے سپاہیوں کے مذہبی جذبات کو ناقابلِ یقین طریق سے ٹھکرا دیا گیا ہے" [1]

جب اس ناقابل استعمال چیز کے استعمال پر اصرار کیا گیا تو سپاہی آپے سے باہر ہو گئے اور سوار فوج کی پلٹن نمبر ۳ کے پچاسی [۸۵] جوانوں نے اس کے استعمال سے صاف انکار کر دیا۔ جس پر انہیں فی الفور فوجی عدالت کے روبرو پیش کر کے دس سال عمر قید کی سزا اسی وقت سنا دی گئی۔ ان میں سے گیارہ نوجوان سپاہیوں کی سزا میں پانچسال کی تخفیف کر دی گئی۔ اس منتقمانہ سزا کا حکم ۹۔ مئی کو ایسے ذلیل کن طریقے سے سنایا گیا جو بالکل تہذیب سے گرا ہوا تھا۔ ایک انگریز مورخ نے اس انسانیت سوز نظارہ کا فوٹو ذیل کے الفاظ میں کھینچا ہے :۔

"بندوقوں اور سنگینوں کے پہرے میں پچاسی [۸۵] جوانوں کو ان کے اپنے فوجی لباس میں سپاہیوں کی حیثیت میں فوجی عدالت کے سامنے پیش کیا گیا اور سزا کو بلند آواز سے سنایا گیا۔ جس کا مقصد سپاہیوں کو بدکار مجرموں کی فہرست میں داخل کرنا تھا۔ فوجی نشانات اُن سے چھین لئے گئے اور وردیاں ان کی پشت سے پھاڑ دی گئیں۔ پھر لوہار زنجیریں اور اوزار لے کر آگے بڑھے۔ اور

---

[1] IBID, L, 431

آناً فاناً میں وہ پچاسی جوان اپنے ساتھیوں کے اس عظیم الشان مجمع کے سامنے انتہائی بے عزتی کی تمام روشن اور ظاہر علامات کے ساتھ یعنی ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنے ہوئے نظر آئے۔ یہ نہایت ہی دردناک اور ذلت آفرین نظارہ تھا جس سے سپاہی بیحد متاثر ہوئے۔ بالخصوص جب انہوں نے اپنے بدقسمت ساتھیوں کی اس ناگفتہ بہ حالت اور مایوسانہ انداز کو دیکھا حالانکہ اُن میں سے بعض اپنی پلٹن میں نہایت ہردلعزیز تھے اور انہوں نے متعدد دفعہ اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کر برٹش حکومت کی ترقی اور وفاداری کا ثبوت بھی دے دیا تھا۔ قیدیوں نے ہاتھ اٹھا کر باآواز بلند جرنیل سے گڑگڑا کر رحم کی درخواست کی کہ ان کو اس شدید مصیبت اور ہلاکت سے بچا لیا جائے۔ پھر یہ دیکھ کر کہ اس طریقہ سے کوئی فائدہ مترتب نہیں ہو سکتا وہ اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوئے اور اس بے عزتی کو خاموشی سے برداشت کرنے پر انہیں شرمندہ کیا اور غیرت دلائی۔ اُس وقت ایک بھی سپاہی اُس میدان میں ایسا موجود نہیں تھا جس نے اپنے سینے میں اس واقعہ سے نفرت اور رنج کے جذبات اُٹھتے ہوئے محسوس نہ کئے ہوں۔ لیکن بھری ہوئی میدانی توپوں اور بندوقوں اور سواروں کے چمکتے ہوئے خنجروں کی موجودگی میں حملہ کرنے کا خیال بھی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ

قیدیوں کو ان کی کوٹھڑیوں میں لے گئے۔ جن پر پہرہ دینے کیلئے انہی کے ساتھیوں کو متعین کیا گیا تھا۔" [1]

ایسے اشتعال انگیز مظاہرے کے بعد دیسی سپاہیوں کا پہرہ لگانا لارڈ کیننگ (CANNING) کی رائے میں "ایک بعید از قیاس حماقت" ہے۔ اور غدر کے پھوٹنے کے کچھ عرصہ بعد باوجود اس امر کے کہ چاروں طرف سے دھڑا دھڑ پھانسیاں دی جا رہی تھیں۔ لیکن اس پر بھی مزید سختی کا مطالبہ زوروں پر تھا۔ اس وقت لارڈ موصوف نے اس خونریزی کی آگ کو فرو کرنے کے لئے ذیل کے الفاظ میں جواب دیا:۔

"گورنمنٹ کی معتدل پالیسی پر حرف گیری کرنا اور اسے غدر کے پھوٹنے کی بنا قرار دینا درست نہیں بلکہ درحقیقت اس آگ کا محرک وہ بیدردانہ سزا کا حکم ہے جو نہایت ہی ذلیل طریق سے میرٹھ کی چھاؤنی میں صادر کیا گیا تھا" [2]

غدر کے واقعہ کے دوسرے دن:۔

"سواروں کی ایک پلٹن اور دو پیادہ پلٹنوں نے بغاوت کر کے سب سے پہلے جیل کو توڑا اور اپنے تمام ساتھیوں کو آزاد کیا۔ اس سے

---

[1] Raye history of the sepoy war (9th RD 1880) Book IV chap ii) [2] Earl CANNING by Sir H. CUNNIGHAM.

فارغ ہو کر اپنے افسروں کے بنگلوں پر حملہ کر کے ہر اُس فرنگی کو جو اُن کے ہتھے چڑھا، بیدردی سے تہ تیغ کیا۔ جس کے بعد انہوں نے دہلی کی طرف یلغار کی۔ ہندوستان کے غدر کی ابتدا عام طور پر اس دن یعنی ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء سے شمار کی جاتی ہے"[1]

بربریت اور کمینگی جو دنیا میں ہمیشہ ایسی مذموم غلامانہ بغاوتوں کا لازمی نتیجہ ہوا کرتی ہے پورے زور سے انسانیت اور شرافت کا ماتم کر رہی تھی۔ چنانچہ دہلی پہنچتے ہی باغیوں نے نہائت سفاکی اور بیرحمی سے انگریز عورتوں، بچوں اور مردوں کا قتلِ عام شروع کر دیا۔

(۶)

تاریخ عالم میں آقاؤں کے خلاف غلاموں کی بغاوتیں اختتام پر محارب فریقین کی طرف سے قربانیوں اور شیطانی ناانصافیوں کا ذخیرہ ہمیشہ چھوڑ دیا کرتی ہیں۔ اگر بغور دیکھا جائے تو مشکل ہے کوئی واقعہ ایسا ملے گا۔ جس میں فریقین نے ایک دوسرے پر رحم کا اظہار کیا ہو، ورنہ دونوں طرف سے خوف و دہشت کا مظاہرہ کیا جاتا رہا ہے یہاں تک کہ ایک فریق دوسرے کو مغلوب کرنے میں کامیاب ہو جائے اٹھارہویں صدی عیسوی میں جزیرہ جمیکا (JAMAICA) کے غلاموں کو بغاوت کی پاداش میں زندہ آگ میں جلا دیا گیا اور توپوں سے باندھ کر اڑا دیا گیا۔ چنانچہ گورنر آئر (EYRE) کے عہد حکومت (۱۸۶۵) میں

[1] Oxford history of India, P: 715.

باغیوں کے پس ماندگان کو نہایت کثیر تعداد میں پھانسیوں پر لٹکا کر یا کوڑے مار مار کر ختم کر دیا گیا۔ چنانچہ ڈمیرارا (DEMERARA) میں ۱۸۲۳ء میں :-

"تیئیس ۲۳ باغیوں کو تو صرف کرنیل لیہے (LEAHY) کے حکم سے فی الفور جان سے مار دیا گیا۔ اس کے علاوہ بے شمار انسانوں کو فوجی عدالت کے حکم سے قتل کیا گیا۔ مارشل لا یعنی فوجی قانون پورے پانچ مہینے تک نافذ رہا اور تقریباً دو سو آدمیوں پر مقدمات چلائے گئے۔ صرف ایک ماہ کی قلیل مدت کے اندر اندر سینتالیس ۴۷ مردوں کو چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں منقسم کرکے پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ جن میں سے بعض کی لاشوں کو تو زنجیروں میں جکڑ کر عام شاہراہوں میں لٹکا دیا۔ اور بعض کے سر کاٹ کر بانسوں پر لٹکائے گئے۔ باقی ماندہ مجرموں کو نہایت بیدردی اور وحشیانہ طریق سے کوڑوں اور بیدوں سے مار مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ جو ایک مجرم کے لئے دو سو سے لیکر ایک ہزار تک لگائے جاتے تھے"[1]

ریاستہائے متحدہ امریکہ میں وحشیانہ قتل و غارت کے واقعات اب بھی دیکھنے میں آتے ہیں۔ جہاں بدقسمت حبشیوں کو معمولی جرائم کی پاداش میں اگرچہ فرضی ہی کیوں نہ ہوں۔ بعض دفعہ نہایت دردناک سزائیں

---

1. Smith of Demerara by David Chamberlain, P. 73.

دی جاتی ہیں اور اکثر حالات ہیں تو وہاں کے مروجہ قانون کی ا
تک سے محروم رکھا جاتا ہے۔ چنانچہ بے گناہ انسانوں کو پکڑ ک
سنگدلی سے ان کو گرم میخوں سے داغ دیا جاتا ہے۔ یہاں تک
وہ اس اذیت کے صدمے سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دید
ہیں۔ ہمیں خوشی ہے کہ یہ بربریت کی نمائش اب رفتہ رفتہ کم ہو
غلام ممالک میں بے اطمینانی کی وجہ سے فوجی بغاوتیں عام
پر نہائیت ہی ہیبتناک ہُوا کرتی تھیں۔ اس لئے کہ فریقین مسلح
کے باعث فی الفور انتقام لینے پر اُتر آتے تھے اور ایک دو
پر دل کھول کر مظالم کرتے تھے۔ کارتھیج (CARTHAGE) میں ا
سپاہیوں نے دو دفعہ بغاوت کی جس کے فرد کرنے کیلئے ہزا
انسانوں کو سُولی کے تختے پر لٹکایا گیا۔ سپارٹیکس (SPARTACUS)
کے ماتحت شمشیر باز سپاہیوں کی بغاوت اس سے زیادہ وحش
طریق سے فرد کی گئی۔ یعنی رومن جرنیل پومپی (POMPY) نے
روم (ROME) سے لیکر اوسٹیہ (OSTIA) تک سڑک کے کن
کنارے دونوں طرف چھ ہزار سُولیاں لٹکا دی تھیں۔ آکسفورڈ
ہند کا مصنف اپنی مخصوص محتاط زبان میں ہندوستانی غدر کی خونر
بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:۔

"یہ بغاوت اپنے پیچھے بیشمار خوفناک حوادث، بے انتہا مصائب
اور متعدد ایسے مکروہ اور رنجیدہ واقعات چھوڑ گئی ہے کہ جن

کے ذکر کرنے سے بھی قلب کو صدمہ پہنچتا ہے" [1]

لیکن اس کے مقابلہ میں ایک اور مورخ جو اشارات میں گفتگو کرنی پسند نہیں کرتا۔ واقعات کی تصویر جس میں ہمارے نزدیک مبالغہ کا شائبہ بھی نہیں، ذیل کے الفاظ میں کھینچتا ہے:۔

"یہ ہنگامہ بظاہر دو وحشی اقوام کے درمیان رونما ہوا تھا۔ جن کے دماغوں سے سوچنے کی طاقت مفقود ہو چکی تھی۔ اور رحم و انصاف کے جذبات اُن کے سینوں سے رخصت ہو گئے تھے۔ صرف ایک ہی خیال دونوں فریق پر غالب آچکا تھا کہ کس طرح ایک دوسرے کو ہمیشہ کیلئے نیست و نابود کیا جا سکتا ہے نتیجہ یہ ہوا کہ فریقین نے نہایت ہی وحشت اور درندگی کا ثبوت دیا۔ اور دونوں طرف سے اس قسم کے دل ہلا دینے والے سنگین افعال سرزد ہوئے۔ جن پر پردہ پوشی ہی زیادہ مناسب ہے" [2]

(۷)

لیکن افسوس ہے کہ اس پردہ پوشی میں بھی معاندانہ رنگ اختیار کیا گیا یعنی انگریز مورخین نے اپنی قوم کی سیاہ کاریاں چھپانے میں تو پوری سرگرمی کا اظہار کیا مگر دوسری طرف ہندوستانی زیادتیوں کی خوب دل کھول کر تشہیر کی۔ اس لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ ہم

---

[1] P. 723. [2] Frank bright, history of England, period IV, P. 528.

ان مستور اور پوشیدہ واقعات کے رُخ سے نقاب اُلٹ کر ایک فیصلہ کُن نظر ڈالیں تاکہ دنیا کے سامنے اس واقعہ کا دوسرا رُخ پیش کیا جا سکے۔ نیز غم و غصہ کی اُس آگ کا اندازہ کیا جا سکے جو اس وقت تک ہندوستانی سینوں میں ہمارے خلاف سُلگ رہی ہے۔ ۱۰ر جون ۱۸۵۷ء کو پشاور میں سرکاری حکم سے پھانسیاں دینے کا واقعہ ہی ایک ایسی روشن مثال ہے جو دنیا کے اطمینان کے لئے کافی ہوگی۔ ایک سو بیس ۱۲۰ انسانوں کو ایک ناکام مگر قبل از وقت بغاوت کے جرم میں ماخوذ کیا گیا:۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ موجودہ حالات اس امر کے متقاضی ہیں کہ سختی کی پالیسی پر عمل کیا جائے جسے مستقبل میں ہمدردی سے تعبیر کیا جائے گا۔ یہ بھی صحیح ہے کہ باغیوں کی کثیر تعداد ایسے اشخاص پر مشتمل ہے۔ جو بالارادہ بغاوت پر آمادہ نہیں ہوئے بلکہ ایک عام ہنگامے کے سیلاب میں بہہ کر اُن افعال کے مرتکب ہو گئے۔ اور اگرچہ انہوں نے اپنے افسران کے خلاف عَلَم بغاوت بلند کیا۔ لیکن انہوں نے اپنے افسران کا خون گرانا پسند نہیں کیا۔ یہی باعث تھا کہ ان کے لئے عفو و رحم کی صدا بھی بلند کی گئی۔ چنانچہ مسٹر نکلسن (NiCHOLSON) نے صاف الفاظ میں مسٹر ایڈورڈز (EDWARDS) ڈپٹی کمشنر پشاور سے پلٹن نمبر ۵۵ کے قیدیوں کے متعلق سفارش کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس پلٹن کے

تمام افسران متفق الرائے ہیں کہ یہ سکھ آخر وقت تک ہمارے حق میں تھے۔ گو وقت کا تقاضا یہ ہے کہ اس وقت نرمی کے خیالات کو ہٹا کر سختی کی پالیسی پر عمل کرنا چاہیئے۔ مگر با ایں ہمہ یہی سفارش کردں گا کہ نوجوان رنگروٹوں اور سکھ سپاہیوں کی جان بخشی کی جائے۔ میری رائے میں آپ بیشک باقی باغیوں کو توپ سے اڑا دیں لیکن ایسے نوجوانوں کو جو بمشکل ابھی لڑکپن کی عمر سے گذرے ہیں اور سکھ سپاہیوں کو جو آخر وقت تک مطیع و فرمانبردار رہے ہیں۔ اگرچہ آخر میں انہوں نے لغزش کھائی۔ اور اپنے آپ کو بغاوت کے سیلاب کی نذر کر دیا ہے۔ ضرور رحم کیا جائے۔

اس پر سر جان لارنس (SIR JOHN LAWRENCE) نے جواب میں لکھا۔ کہ چونکہ یہ ہمارے خلاف لڑتے ہوئے گرفتار ہوئے ہیں۔ اس لئے کسی قسم کے رحم کے مستحق نہیں۔ بہرحال مزید غور کرنے سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اِن سب کو موت کے گھاٹ اتارنا مناسب نہیں ہوگا۔ کیونکہ میرے خیال میں ہمارا یہ فعل خداوند تعالیٰ کی بارگاہ میں منصفانہ نہیں سمجھا جائیگا۔ ایک سو بیس[۱۲۰] ایک بہت بڑی تعداد ہے جسے ایک ہی وقت میں فنا کر دینا کچھ زیادہ مناسب نہیں ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ ہمارا مقصد اس وقت تو عام طور پر سخت گیری کرنے سے دلوں میں ہیبت اور خوف بٹھانا ہے۔ جو میرے خیال میں نہایت مؤثر طریق پر پورا

ہو سکتا ہے اگر ہم ان میں سے ایک چوتھائی یا ایک تہائی قیدیوں کو ہلاک کر دیں - میرے خیال میں کافی تعداد ایسے قیدیوں کی نکل سکتی ہے - جن کے چال چلن مشتبہ تھے - یا جنہوں نے اپنے افسران کی علانیہ عدول حکمی کی یا جنہوں نے بغاوت پھیلائی یا بغاوت کے سرغنے تھے وغیرہ وغیرہ - ایسے تمام مجرمین کو پھانسی کی سزا ملنی چاہیئے - اور اگر ایسے اشخاص کی تعداد مقررہ تناسب سے کم ہو تو میری رائے میں پھر باقی قیدیوں میں سے تمام پرانے سپاہیوں کو منتخب کر کے شامل کر لینا چاہیئے ان تمام منتخب کردہ قیدیوں کو یا تو گولی سے مار دینا چاہیئے یا توپ سے باندھ کر اڑا دینا چاہیئے - جیسا کہ اس وقت مناسب سمجھا جائیگا - باقی ماندہ مجرمین کو چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں تقسیم کر کے تین سال سے لیکر سات سال تک کی قید کی سزا دینی چاہیئے۔[۱]

لارنس (LAWRANCE) کی چٹھی دنیا کی ایک ایسی آواز ہے جسے ہم ہمیشہ کیلئے خیر باد کہہ چکے ہیں بلکہ اس کی بین السطور پاکبازی پر اب کوئی یقین نہیں کر سکتا - اور اگرچہ چٹھی کے بعض فقروں سے انجیل مقدس کی تعلیم کا ایک ہلکا سا پرتو بھی جھلکتا ہے - مگر غدر کے بعد کے ہولناک مظالم سے اس کی منافقت بالکل واضح ہو جاتی ہے۔

لفٹننٹ - ابرٹس ROBERTS جو بعد میں قندھار کے لارڈ رابرٹس کی حیثیت میں مشہور ہوا - پشاور کی متذکرہ صدر پھانسیوں کے بعد جن پر

---

[۱] KAYE, Book VI Chaptir IV

لارنس کی بحث ابھی آپ پڑھ چکے ہیں۔ اپنی والدہ کو ایک چھٹی میں اس واقعہ پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:۔

"ہم پشاور سے جہلم پیادہ پا سفر کرتے ہوئے پہنچے اور راستے میں کچھ "کام" بھی کرتے چلے آئے۔ یعنی باغیوں سے اسلحہ چھینا اور ان کو پھانسیوں پر لٹکایا۔ چنانچہ توپ سے باندھ کر اڑا دینے کا جو طریقہ ہم نے اکثر استعمال کیا ہے۔ اس کا لوگوں پر ایک خاص اثر ہوا۔ یعنی ہماری ہیبت ان کے دلوں میں بیٹھ گئی۔ یہ طریقۂ سزا اگرچہ نہائت ہی دلخراش منظر ہے لیکن بحالاتِ موجودہ اس کے سوا چارہ نہیں۔ فوجی عدالت کے حکم سے فی الفور سر قلم کر دیئے جاتے ہیں اور یہی پالیسی اس وقت ہر چھاؤنی میں عمل میں لائی جاتی ہے"۔[1]

لارڈ رابرٹس کے نزدیک اس "کام" کا مقصد یہ ہے کہ:۔

"ان بدمعاش مسلمانوں کو بتا دیا جائے کہ خدا کے حکم سے صرف انگریز ہی ہندوستان پر حکومت کریں گے"۔[2]

اور ایک اور چھٹی کے دوران میں جو اُس نے دسمبر میں اپنی بہن کو لکھی لارڈ رابرٹس نہائت وثوق سے اس امید کا اظہار کرتا ہے کہ خدا کی عنایت اور اپنے زبردست حلیف کی امداد سے ہم مستقبل قریب

---

1. Letters written during indian mutiny June 1857.

2. Ibid, Letters written 31st December 1857.

میں ایک خوشگوار نتیجے تک پہنچ جائیں گے ۔ یعنی :۔

" اگر خدا نے چاہا تو وسط فروری تک ہم باغیوں کو نیست ونابود کر دیں گے "۔[1]

عہد وکٹوریہ کے مذہبی پیشواؤں کی منافقت اور ریاکاری سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ ایک طرف تو نہایت شد و مد کے ساتھ توراۃ کی مفروضہ خونخوار تعلیم کے خلاف نکتہ چینی کرتے ہیں لیکن ہندوستان کے غدر کے ہولناک مظالم کا بہت بڑا ذخیرہ آنکھوں کے سامنے رکھتے ہوئے بھی بالکل سکوت اختیار کرتے ہیں ۔ حالانکہ عام طور پر پراپیگنڈا کر کے رائے عامہ کو مغالطہ دیا گیا تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ طرز زندگی کے فریب وہ طلسم سے تنگ آکر انسان حسرت سے اپنے آباواجداد کے زمانہ کی واپسی کی آرزو کرتا ہے ۔ یقیناً موجودہ مہذب دنیا کے سیاہ کارنامے دیکھ کر اُس زمانے کا انسان قطعاً کسی قسم کی کوئی تکلیف محسوس نہ کرتا ۔ بالخصوص آج جبکہ ترقی یافتہ اور ہمدرد سوسائٹی میں سلطنت کی بنیاد باہمی محبت اور اخوت قرار دی گئی ہے تو موجودہ سفاکی اور بربریت جس کی قرار واقعی نمائش ہندوستان کے غدر کے فرو کرنے میں روا رکھی گئی ہے قیاس سے باہر ہے ۔ گذشتہ جنگ یورپ اگر ان کے زمانہ میں ہوتا تو موجودہ منافقت اور دھوکہ دہی کی جگہ ان کے معتقدات کے اور زیادہ قوی کرنے کا موجب ہوتا ۔

---

[1] Ibid, Letters written 28th December 1857.

یہ فیصلہ کیا گیا کہ مسیحی انصاف کا اقتضا یہ ہے کہ چالیس انسانوں کو پھانسی کے تختے پر لٹکایا جائے۔ چنانچہ ۱۰ جون ۱۸۵۷ء کے دن چالیس بدقسمت انسانوں کو ممکن سے ممکن اذیت پہنچا کر نہایت ہولناک طریق سے منظر عام میں توپوں سے باندھ کر اڑا دیا گیا:۔

"یہاں پر یہ امر خاص طور پر توجہ کے قابل ہے کہ نہ تو سر ہربرٹ ایڈورڈز (SIR HERBERT EDWARDS) نے پشاور کی سرکاری رپورٹ میں اور نہ ہی سر سڈنی کاٹن (SIR SYDNEY COTTEN) نے اپنی مطبوعہ سرگذشت میں اس دردناک سزا کی پبلک نمائش کا کوئی ذکر کیا ہے۔ جب ان "بہادر" انسانوں نے اس رنجیدہ واقعہ کے بیان سے جھجک محسوس کی ہے۔ اور اخفا کو ترجیح دی ہے تو میں بھی اس کی مزید تفصیل میں جانا مناسب نہیں سمجھتا۔ لیکن جہانتک اس واقعہ کی تفصیل اور جزئیات سے تعلق ہے وہ نہایت ہی درد انگیز اور ہولناک ہیں اور اس وقت بھی اُس زمانہ کی دستاویزوں کی شکل میں میرے پاس محفوظ ہیں" [1]

بہت ہی کم تعداد ایسے انسانوں کی تھی۔ جنہوں نے یا تو ان انسانیت سوز سزاؤں کو دیتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا یا دوسروں سے ان کے متعلق سُنا تھا۔ لیکن سب کے سب مسٹر ایڈورڈز اور سر ہنری کاٹن

---

[1] Kaye, BOOK VI Chapter IV

کی طرح خاموش رہے۔ جیساکہ مسٹر کیوی KAYE نے اوپر بیان کیا ہے۔ غدر کو شروع ہوئے ابھی چند ہفتے ہی گذرے ہوں گے کہ ہمارے ہاں کے لوگ اس حد تک اس خطرے کی ہولناک تفصیلات سے بہرہ اندوز ہو گئے کہ بعد میں اِن واقعات کے بیان کرنے میں نہ صرف اُن کی فطری نازک مزاجی ہی کافور ہو گئی بلکہ وہ ایک قسم کی لذّت اور خوشی محسوس کرتے تھے۔ مثال کیلئے ہم ایک پادری صاحب کی بیوہ کی ایک تحریر کی تصویر پیش کرتے ہیں :۔

"لڑائی کے اختتام پر بہت سے قیدیوں کو پھانسی پر لٹکایا گیا۔ اور یہ معلوم ہونے پر کہ اس قسم کی موت کی وُہ کوئی خاص پرواہ نہیں کرتے تو ان میں سے چار آدمیوں کو فوجی عدالت کے حکم سے توپوں سے باندھ کر اُڑا دیا گیا۔ چنانچہ ایک روز ایک توپ کے بہت بڑے دھماکے کی آواز سے ہم چونک پڑے۔ جس کے ساتھ ہی ایک ناقابل بیان دھیمی مگر وحشتناک چیخ بھی سُنائی دی۔ دریافت کرنے پر ایک افسر نے ہمیں بتایا کہ یہ ایک نہائت ہی کرب انگیز نظارہ تھا۔ یعنی ایک توپ میں اتفاق سے بارُود زیادہ بھرا ہوُا تھا۔ جس کے چلائے جانے سے بدقسمت ملزم کا گوشت ریزہ ریزہ ہو کر فضائے آسمانی میں اُڑا اور تماشائیوں پر خون کے چھینٹے اور گوشت کے ٹکڑے گرے اور اس کا سر ایک راہرو پر اس زور سے گرا کہ اس کو بھی

چوٹ آئی"۔ [۱]

(۸)

توپوں سے باندھ کر اڑا دینے کی سزا ایسٹ انڈیا کمپنی نے مغلیہ سلطنت سے وراثت میں حاصل کی تھی۔ فرانسیسی جرنیل لالی LALLY اور مرہٹے بھی اکثر یہی سزا دیا کرتے تھے۔ سزا دہی کا یہ کوئی ایسا بڑا طریق نہیں تھا۔ جسے انہوں نے یہاں پر استعمال کرنا شروع کیا بلکہ عہد گذشتہ میں سزا دینے کا کوئی دردناک طریقہ اگر بدن کے رونگٹے کھڑا کر دیتا تھا۔ تو وہ میخیں گرم کر کے مجرموں کو داغنا ہے۔ دماغ پر اس سزا کا ایسا مہلک اثر پڑتا ہے کہ بعض دفعہ تو انسان نواب معین الدین حسن کے بیانات کو جن میں اس دردناک سزا کا ذکر ہے۔ نہ تو پڑھنے کے لئے تیار ہوتے ہیں اور نہ ہی سُننے کیلئے۔ لیکن گورنمنٹ بنگال کے سرکاری کاغذات میں اب بھی بعض ایسی دستاویزیں محفوظ ہیں۔ جن کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے۔ کہ انگریز نہایت کثرت سے اس ہولناک سزا کا استعمال کرتے تھے۔ چنانچہ ایک انگریز افسر کی چھٹی ابھی تک محفوظ ہے جس میں اٹھارہویں صدی کے آخری دَور کے حالات پر بحث کرتے ہوئے اس دردناک طریق سزا کی ذیل کے الفاظ میں مذمت کی ہے:۔

"آخر کب تک ہم بنی نوع انسان کو اس دلخراش طریق پر گرم سلاخوں

---

[۱] Mis coopland, alady's ascape from Gawaliar, P. 233.

پر تڑپتے اور بھُنتے دیکھنے کی اذیت برداشت کرتے رہیں گے؟"

بمقابلہ اس کے توپوں سے باندھ کر ہلاک کر دینے کا طریق اس حد تک اذیّت رساں نہیں۔ کیونکہ زیادہ سے زیادہ اس وقت دماغ میں ایک فوری رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے اور بس۔ ہم نے اس سزا کے استعمال کو پسند کر کے عملاً اپنے آپ کو بربریت اور سنگدلی کی اُسی سطح پر کھڑا کر دیا ہے جہانکہ اس سے پیشتر ہم شاہانِ مغلیہ کے خلاف نفرت و حقارت کا اظہار کیا کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اِن دردناک مناظر کی تصاویر تیار کر کے انگلستان اور دیگر ممالک میں تقسیم کی گئیں۔ جس میں انگریزوں کے ہاتھوں ہندوستانیوں کو توپوں کے ساتھ بندھے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ اِن تصاویر نے انگلستان میں وہی اثر کیا جو اس سے پیشتر ماسکو کی پبلک کے دلوں پر ہوا تھا۔ جب روسیوں کے ہاتھوں پولینڈ والوں کے قتل عام اور پھانسیوں کے دردناک مناظر کی تصاویر اُن کے سامنے لائی گئی تھیں۔ یقیناً مہذب دنیا ایسی دردناک سزاؤں کو وحشیانہ جذبات کی نمائش سے تعبیر کرے گی لیکن دوسری طرف نتیجہ یہ نکلا کہ سرحد کے وحشی اور غیر مہذب قبائل جو عام طور پر خونریزی اور ہلاکت کے مناظر کو دلبستگی اور تفریح کا سامان سمجھتے چلے آئے ہیں۔ ہماری اِن سیاہ کاریوں سے حد درجہ بددل ہوئے۔ چنانچہ اس ذہنیت کی تبدیلی کا نقشہ ایک مورخ نے ذیل کے الفاظ میں کھینچا ہے :-

"جب انہوں (سرحدی اقوام) نے ہماری جیسی مہذب اور شائستہ قوم کو متانت اور سنجیدگی کے ساتھ وحشت اور بربریت کے اُن تمام مکروہ افعال کے مرتکب ہوتے ہوئے دیکھا جو ایک فوجی پریڈ کی باضابطگی کے ساتھ عمل میں لائے جاتے تھے تو ہمارے متعلق برتری اور بڑائی کے تمام عقیدتمندانہ خیالات اُن کے دلوں سے جاتے رہے" [1]

اس سے بہت عرصہ پہلے نکلسن NICHOLSON جسے ہم اپنے بچپن کی خیالی دنیا میں ایک نڈر دیوتا کی حیثیت سے یاد کیا کرتے تھے۔ نیز جسے ناول نویس کے معروضہ انگریزی کیریکٹر کی "متانت وشجاعت" کی شہرت بھی مل چکی تھی۔ وہی نکلسن مسٹر ایڈورڈز Mr EDWARDS کو خط لکھتے ہوئے یوں رقمطراز ہوتا ہے کہ:۔

"دہلی میں انگریز عورتوں اور بچوں کے قاتلوں کے خلاف ہمیں ایک ایسا قانون پاس کرنا چاہیئے جس کی رُو سے ہم اُن کو زندہ ہی جلا سکیں۔ یا زندہ ان کی کھال اُتار سکیں یا گرم سلاخوں سے اذیت دیکر ان کو فنا کے گھاٹ اُتار سکیں۔ ایسے ظالموں کو محض پھانسی کی سزا سے ہلاک کر دینے کا خیال ہی مجھے دیوانہ کئے دیتا ہے۔ میری یہ دلی خواہش ہے کہ کاش میں دنیا کے کسی ایسے گمنام گوشے میں چلا جاؤں جہاں مجھے یہ حق حاصل ہو کہ میں حسب ضرورت سنگین انتقام

---

[1] Kaye, Book VI chapter IV,

لیکر دل کی بھڑاس نکال سکوں" ؎۱

اس دستاویز میں آگے چل کر وہ انتقام کی آگ کو فرو کرنے کیلئے م
مذہبی تعلیم تک کو دلیل کے طور پر پیش کرنے سے نہیں چوکتا۔ چنا
وہ لکھتا ہے کہ:۔

"بچوں اور عورتوں کے قاتلوں کو اذیت دینے کے سلسلے میں میرا خیال یہ ہے کہ اس قسم کی ایذادہی کے طریقے مناسب اور صحیح نہ بھی ہوں۔ پھر بھی ہمیں ان طریقوں کو بالضرور استعمال کرنا چاہیئے۔ کیونکہ یہاں پر اس قسم کے انتقام لینے کے طریقے رائج ہیں۔ دوسری طرف انجیلِ مقدس میں بھی یہ حکم ہے۔ کہ مجرموں کے اعمال کی مناسبت سے سزا دی جائیگی۔ بنابریں کوئی وجہ نہیں کہ کیوں نرم سزا پر اکتفا کیا جائے۔ اگر ایسے قاتلوں کے حق میں پھانسی کی سزا کافی سمجھی جائے گی تو میرے خیال میں معمولی باغی تو ان سے بدرجہا معمولی سزا کے مستحق ہیں۔ اگر میرے بس میں ہو باوجود اس امر کے کہ مجھے پہلے ہی یہ بتا دیا جاتا کہ میری موت کل واقع ہونے والی ہے۔ پھر بھی میں ان بدبختوں کو ایسی شدید ایذائیں دے کر ہلاک کرتا جہانتک کہ میرا دماغ یاوری کرتا۔" ؎۲

؎۱ Kaye, Book VI ch 1,

؎۲ Kaye, chapter 1, Book V.

لیکن نکلسن کی چھٹیاں ایسی دماغی کوفت کی حالت میں قلمبند کی گئی ہیں جبکہ مسلسل و پیہم دردناک حوادث کی اطلاعات نے متانت سے غور کرنے کی طاقت کو بیکار کر دیا تھا۔ مگر اس سے بھی زیادہ مکروہ اور مذموم خیالات ایک ایسے شخص کی طرف سے ظاہر کئے گئے ہیں۔ جس کے متعلق ہمیں بتایا گیا ہے کہ اُس وقت تمام عیسائی قوم میں اُس سے بہتر عالی دماغ اور نیک نفس انسان نظر نہیں آتا تھا۔ یہ الفاظ اُن ہدایات کے سلسلے میں ظاہر کئے گئے تھے۔ جو مسٹر ہنری ٹکر (HENRY TUCKER) کمشنر بنارس کے نام جاری کی گئی تھیں :-

"تمہاری طبیعت چونکہ فطرتاً نرم واقع ہوئی ہے اس لئے بحالاتِ موجودہ میں سخت متفکر ہوں لیکن آپ کو واضح رہنا چاہیئے۔ کہ اس قسم کے تمام رقیق جذبات و احساسات کو مطلقاً خیرباد کہنا ہوگا۔ آخر مجسٹریٹوں کو بے فائدہ طور پر تلوار کو بے نیام کرنے کیلئے حکم نہیں دیا گیا۔ نیز واضح رہے کہ خدائی قانون بھی ایک انسانی جان کے ضائع کرنے کی پاداش میں قاتل کے لئے کسی قسم کی رعائت نہیں کرتا۔ علاوہ ازیں مشرقی ممالک کا تو یہ خاصہ ہے کہ یہاں پر محکوم کے دل میں حاکم کا رُعب، و دبدبہ ہمیشہ زندہ رکھا جائے۔ کیونکہ ایسے ہی حالات کے زیر اثر محکوم کے زاویہ نگاہ میں ایک گونہ تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ اور وہ حکومت

کی موجودگی کو اپنی بقا کے لئے پسندیدہ خیال کرتا ہے"[1]

امریکن مورخ ایمرسن (EMERSON) ۱۸۵۶ء میں انگریزوں کے مذہبی جذبات پر رائے زنی کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:۔

"انگلستان کی حکومت نے عام طور پر توراۃ کی مفروضہ درشت تعلیم کو اپنا شعار بنا لیا ہے۔ یہاں تک کہ انجیل کا تو پہلا صفحہ تک اُلٹ کر نہیں دیکھتی"[2]

کوُپر (Cooper) ڈپٹی کمشنر امرتسر غدر کے شروع ایام میں اپنی پالیسی کی وضاحت کرتے ہوئے جس پر کہ اُس نے خود بھی سختی سے عمل کیا تھا۔ فخریہ طور پر اس طرح بیان کرتا ہے کہ پنجاب کے حکام نے تو اِس اصول پر عمل کیا ہے کہ ایسے حالات میں ابتدا ہی میں اس قسم کی وحشیانہ سختی سے جواب دیا جائے کہ انتقام کا تصور بھی فریق مخالف کو لرزہ براندام کر دے۔ چنانچہ وُہ لکھتا ہے کہ:۔

"مسٹر مونٹ گمری (Mont Goomery) کے حکم سے پنجاب میں بھی جہاں کہ عام طور پر لوگ ابھی تک وفادار ہیں۔ ایک سکھ پلٹن کے صوبیدار، سوار پولیس کے رسالدار اور ایک داروغہ جیل کو "فرض کی کوتاہی" کے الزام میں پھانسی پر لٹکانا ضروری سمجھا گیا۔ اس سے مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو بخوبی ذہن نشین

---

[1] Kaye, Book VI, Chapter I.

[2] English Traits, XIII Relegion

ہو جائے کہ پنجاب کے حکام بہر حال ابتدا ہی میں "بلا توقف متشددانہ کارروائی" کرنے کی پالیسی سے لوگوں کے دلوں میں اپنا رعب قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ صرف یہی ایک ایسا طریقہ ہے جس سے اس "نیم وحشی ملک" میں وقار قائم رکھا جا سکتا ہے۔ دوسری طرف ایک سخت پالیسی کا مقصد یہ بھی ظاہر کرنا تھا کہ حکومت رعایا سے "غیر مشروط اور غیر مبہم وفاداری" کی متوقع ہے۔ نہ کہ رعایا کی اخلاقی بُردباری کے بھروسہ پر جو کہ ایک حد تک گورنمنٹ کے استقلال کی شکست کے مترادف ہے" [1]

جن اذیتوں کو دینے کی آرزو کا اظہار نکلسن (NICHOLSON) نے نہایت بے چینی سے کیا تھا۔ ان کے پورے ہونے میں کچھ زیادہ عرصہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ مسٹر موبری تھامسن [2] (Mobrey Thompson) نے بعض قیدیوں کی دردناک سرگذشت جن کو اس نے خود قید کیا تھا۔ سر ہنری کاٹن (Henry Cotton) کو ذیل کے الفاظ میں سنائی:

شام کے وقت ایک سکھ اردلی میرے خیمے میں آیا اور سلام کر کے پوچھنے لگا۔ آپ غالباً یہ دیکھنا پسند کریں گے کہ ہم نے قیدیوں کے ساتھ کیسا سلوک کیا ہے۔ یہ خیال کرتے ہوئے کہ کہیں قیدیوں کے ساتھ زیادتی نہ کی گئی ہو میں فوراً اٹھ کر ان کے خیمے میں گیا۔

---

[1] The crisis in the Punjab, P. 151, 152.

[2] مسٹر موبرے تھامسن اُن چند نفوس میں سے تھے جو حادثہ کانپور سے صحیح و سلامت بچ کر نکل آئے تھے۔

جہاں پر میں نے اُن بد بخت مسلمانوں کو عالم نزع میں بے حال دیکھا یعنی مشکیں باندھ کر برہنہ اُن کو زمین پر لٹایا ہوا تھا اور سر سے لیکر پاؤں تک تمام جسم کو گرم تانبے سے داغ دیا تھا۔ اس روح فرسا نظارے کو دیکھ کر میں نے اپنے پستول سے ان کا خاتمہ کر دینا ہی اُن کے حق میں مناسب سمجھا۔ سر ہنری کاٹن نے جب حیران ہو کر یہ سوال کیا کہ اس کے بعد کیا کیا گیا تو جواب یہ ملا کہ کچھ بھی نہیں "[1]

یہاں پر قدرتی طور سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیوں کچھ کیا جاتا؟ کسی واقعہ کو زیادہ عرصہ تک حافظہ میں محفوظ رکھنے کی صلاحیت مشرقی دماغ کو فطرتاً کسی قدر زیادہ نصیب ہوئی ہے۔ حالانکہ انگریز قوم کا حافظہ اس کے مقابلہ میں اتنا تیز نہیں ہوتا۔ اور یہی وجہ ہے کہ اگرچہ ہم دوسری قوموں کی قوت حافظہ پر حیرت کا اظہار کیا کرتے تھے۔ کہ وہ کس طرح ساٹھ سال پہلے کی پھانسیوں یا گولیوں کے ذریعہ ہلاکت کے واقعات کو یاد رکھے ہوئے ہیں۔ لیکن ان سے بھی زیادہ حیرت و استعجاب سکھ قوم کی قوتِ یادداشت پر ہوتی ہے جن کے آباؤ اجداد کو شاہانِ مغلیہ کے ہاتھوں دردناک مظالم سے جان دیئے ہوئے اگرچہ ڈیڑھ سو سال کا زمانہ گذر چکا ہے لیکن اُن کی تلخ یاد ابھی تک

[1] Cotton, Indian & Home memories, P. 143.

ہر ایک سپاہی کو سزا دیتے وقت بغیر کسی قسم کی تحقیقات کرنے کے فرض کر لیا جاتا تھا کہ اس نے انگریز عورتوں اور بچوں کو قتل کیا ہے۔

اُن کے سینوں میں تازہ ہے جس کا پورا انتقام اُنہوں نے غدر میں مسلمانوں سے لیا ہے۔ یعنی وُہ نہائت وحشیانہ مسرّت کے ساتھ غدر کے ہنگامے میں دہلی کے برخلاف اپنا بدلہ لینے کے لئے ہمارے مددگار کے طور پر شریک ہوئے۔ چنانچہ ایک عینی شاہد بیان کرتا ہے کہ کس طرح سکھوں اور انگریزوں نے ایک مسلمان قیدی کے چہرہ کو بار بار سنگینوں سے زخمی کر کے زندہ ہلکی آگ میں جلایا۔

"بدنصیب قیدی کے جلتے ہوئے گوشت سے مکروہ بدبُو نکل کر آس پاس کی فضا کو مسموم بنا رہی تھی۔ اُنیسویں صدی میں جبکہ تہذیب اور شائستگی پر ناز کیا جاتا تھا ایک ایسا دردناک نظارہ دیکھنے میں آتا ہے کہ ایک انسان نہائت وحشیانہ طریق سے زندہ آگ میں جلایا جا رہا ہے اور سکھ اور یورپین نہائت اطمینان اور متانت سے چھوٹی چھوٹی ٹولیاں بنا کر اردگرد کھڑے دیکھ رہے ہیں۔ گویا کہ وُہ ایک تفریح کا سامان تھا۔ کوئی شخص اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ خواہ بدقسمت قیدی کے مفروضہ جرائم کتنے بھی سنگین کیوں نہ ہوں۔ پھر بھی موجودہ سفاکانہ اور دردناک سزا کے بھگتنے کے بعد یقیناً اس نے اپنے گناہوں کی قرار واقعی پاداش اُٹھا لی ہے" ؎

ٹائمز آف انڈیا اخبار کے فوجی نامہ نگار مسٹر رسّل (RUSSEL) نے

؎ LEE MAJENDIE, "UP AMONG THE PANDIES, P. 187.

بھی اس واقعہ کی تصدیق کی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ:۔

"چند دنوں کے بعد میں نے اُس شخص کی جلی ہوئی ہڈیوں کو اُسی میدان میں پڑا ہوا پایا" ؎

دنیا کے تمام دیگر ممالک کے مقابلہ میں میرے ملک کا دامن اس قسم کے صریح مظالم سے یکسر پاک ہے۔ انسانی تاریخ اگرچہ افسردگی سے بھری پڑی ہے۔ لیکن بہرکیف ہم اس امر کے اعلان کرنے کا حق رکھتے ہیں کہ اگرچہ ہم سے بھی کبھی زیادتیاں ہوئیں۔ پھر بھی ہم شاذ ہی خونخوار درندے ثابت ہوئے۔ یہ حادثہ ہماری سرگذشت میں بالکل مستثنےٰ حیثیت رکھتا ہے لیکن غدر بھی تو اپنی نوعیت کی ایک ممتاز تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ انسانی حقوق کی محافظت میں سب سے پہلی کمزور آواز جس نے دنیا کو ان وحشیانہ مظالم سے روشناس کر کے روکنے کی کوشش کی وہ ٹائمز آف انڈیا کے ایڈیٹر مسٹر ڈی لین (Delean) کی تھی۔ جو آئرلینڈ کے رہنے والے ہیں۔ چنانچہ اپنے ایک آرٹیکل میں اس نے لکھا کہ:۔

"زندہ مسلمانوں کو سؤر کی کھال میں سینا۔ یا پھانسی سے پہلے اُن کے جسم پر سؤر کی چربی ملنا۔ یا زندہ آگ میں جلانا۔ یا ہندوستانیوں کو مجبور کرنا کہ وہ ایک دوسرے

؎ My diary in India in the year 1858-1859, P. 301, 302.

کے ساتھ بدفعلی کریں - ایسی مکروہ اور منتقمانہ حرکات کی دنیا کی کوئی تہذیب بھی کبھی اجازت نہیں دیتی - ہماری گردنیں شرم اور ندامت سے جھک جاتی ہیں اور یقیناً ایسی حرکات عیسائیت کے نام پر ایک بدنما دھبہ ہیں - جن کا کفارہ لازمی طور پر ہمیں بھی ایک دن ادا کرنا پڑیگا - اس قسم کی دردناک جسمانی اور دماغی سزاؤں کے دینے کا ہمیں مطلقاً کوئی حق نہیں اور نہ ہی ہم یورپ میں ایسی سزائیں دینے کی جرأت کر سکتے ہیں "[1]

یہاں پر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ کس طرح ہماری قوم نے غدر کے متعلق تمام مفروضہ بیانات کو بغیر تحقیقات اور تجسس کے صحیح تسلیم کر لیا - یہ تمام واقعات دنیا کے دوسرے گوشوں میں ہم سے بہتر طریق پر پہنچے جس کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ جب ہم نے پولینڈ اور آرمینیا کے باشندوں کو مصائب اور تباہی سے بچانے کیلئے نہایت دیانتدارانہ آواز بلند کی تو یورپ نے کسی قدر سرد مہری سے اس آواز کو سنا اور قرار واقعی متاثر نہ ہوا - چنانچہ "ٹائمز" کا نامہ نگار اظہار رائے کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ :-

"دنیا کی دیگر اقوام ہمارے خارجی معاملات کا بغور دلچسپی سے معائنہ کر رہی ہیں - اگرچہ خشکی اور سمندر کی ایک بہت بڑی مسافت اُن کے اس ارادہ میں حائل ہے - پھر بھی ایک فرانسیسی جرنیل

---

1. Russel, Diary, ii, P. 43 (May 1858)

سے ہمارے افسران کے بعض مفروضہ مظالم کے خلاف سر کولن (Collen) کو ایک چٹھی کے ذریعہ احتجاج کیا۔ لیکن اُسے معلوم ہونا چاہیئے کہ ہماری گورنمنٹ ایک باغی کے فیصلہ میں خون گرانے سے قطعاً کوئی گریز نہیں کیا کرتی"۔ ؎

(۹)

اس موقع پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اعلیٰ تہذیب و شائستگی اور دعوئے مسیحیت کی چیخ و پکار کو صحیح ثابت کرنے کیلئے اور اپنی عزت و وقار برقرار رکھنے کیلئے ہماری قوم نے ایسا عملی قدم بھی اُٹھایا ہے یا نہیں؟ تو جواب میں یہ کہا جائے گا کہ ہاں اس قسم کی ایک کوشش تو ضرور کی گئی جو اگرچہ ناکام رہی لیکن پھر بھی ایسی شرمناک حرکات سے بیزاری کا اعلان ہماری قومی عزت کے تحفظ کے سلسلے میں آج بھی روزِ روشن کی طرح درخشاں ہے۔ ۳۱۔ جولائی ۱۸۵۷ء کو گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کی طرف سے ہندوستان میں مفصل ہدایات جاری کی گئیں کہ غیر معین طریق سے دیہات کو آگ لگانا فی الفور بند کر دیا جائے۔ اور مجسٹریٹوں کو حکم دیا گیا کہ وہ غیر مسلح آدمیوں کو فوج سے بھاگے ہوئے سپاہی سمجھ کر ہرگز کوئی سزا نہ دیں۔ بہت سی ایسی سول عدالتوں سے موت اور عمر قید کے اختیارات واپس لے لئے گئے۔ کیونکہ ان کا استعمال نہائت بیدردی سے کیا گیا تھا۔

؎ Russel, i, P. 221, 222.

۲۸ - اگست کو مسٹر جان گرانٹ (John Grant) کو وسط ہند کا گورنر اس لئے مقرر کیا گیا تاکہ وہ الٰہ آباد اور دوسرے مقامات پر بے تحاشا پھانسیوں کے سلسلے کو بند کر دیں۔ باوجود اس امر کے کہ ایک کثیر طبقے کی طرف سے وائسرائے اور مسٹر گرانٹ کی شدید مخالفت کی گئی۔ یہانتک کہ تعریض کے طور پر "پھانسیوں کے رد کرنے والا گرانت" (Anti Hangman Grant) اور "رحمدل کیننگ" (Clemency Canning) وغیرہ نام دے کر اُن کی ہنسی بھی اُڑائی گئی۔ پھر بھی اس مخالفت کی کوئی پرواہ نہ کی گئی۔ جب اگست میں انگریزی فوج ہندوستانی دیہات جلانے کی مہم سے واپس آ رہی تھی تو راستے میں انہوں نے وفادار سپاہیوں کی ایک جماعت کو بلا وجہ گولیوں اور سنگینوں کا نشانہ بنا دیا۔ چنانچہ انتقام کے اس خوفناک مظاہرے پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے ٹائمز آف انڈیا نے اس واقعہ کو "جنگی یا وحشی انصاف" سے تعبیر کیا۔ لیکن جنرل آوٹرم (OUTRAM) کی رائے میں یہ واقعہ "معصوم انسانوں کا سنگدلانہ قتل" تھا۔ چنانچہ ستمبر میں جنرل آوٹرم نے مسٹر گرانٹ کو ایک مراسلہ میں ذیل کے الفاظ لکھے:-

"موجودہ وقت اس امر کا مقتضی ہے کہ کھلے طور پر یہ ظاہر کر دیا جائے کہ ہم اس قتل و غارت گری کے بالکل خلاف ہیں تاکہ یہ حقیقت بالکل واضح ہو جائے کہ ہمارا منشاء ہندوستانیوں کو نیست و نابود

کرنے کا نہیں۔ یا ہم سپاہیوں کے محض اس بنا پر مخالف نہیں کہ وہ سپاہی ہیں "۱

غدر کے اختتام کے ایک مہینہ بعد ٹائمز کی رائے ہیں :۔

"شائد ہی چند انگریز ایسے ہوں جو میدانِ جنگ میں سپاہیوں کی ہلاکت کو باغیوں کی وحشیانہ حرکات کے مقابلہ میں کافی سمجھتے ہوں"

لیکن اس کے چند ہی ماہ بعد اس اخبار کی رائے تبدیل ہو جاتی ہے۔ اور وہ گورنمنٹ کی پالیسی پر نکتہ چینی کرتے ہوئے اس رائے کا اظہار کرتا ہے کہ قتل و غارت کے سیلاب کو روکنے کے لئے مناسب تدابیر اختیار نہیں کی گئیں۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ :۔

"سپاہیوں کو بے دریغ قتل کرنے کا نتیجہ یہ نکلتا کہ مدراس اور بمبئی کی فوجوں میں بغاوت پیدا ہو جاتی "۲

بہت ممکن ہے کہ ان مقامات پر بھی بغاوت ہو جاتی لیکن اس امر کے تسلیم کرنے میں تو کوئی کلام نہیں کہ سپاہی اس حد تک خوفزدہ ہو گئے تھے۔ کہ اول تو انہوں نے فوجوں سے بھاگنا شروع کر دیا پھر باغیوں میں شامل ہو کر ہمارے مقابلے میں انتہائی مشکلات پیدا کرنے میں پورا زور صرف کر دیا۔ جو ہمارے لئے بیحد تکلیف دہ ثابت ہوا۔ ایں ہمہ ان پر کسی قسم کے رحم کا اظہار نہیں کیا گیا۔ چنانچہ ایک ماتحت

۱؎ 21st October 1857 (MontGOMERY Martin)

۲؎ 6th February 1858 (MontGomery Martin)

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] The Punjab [illegible]

[illegible]

[illegible]

ایک پادری کی بیوہ جس کا خاوند غدر میں قتل کر دیا گیا تھا۔ نہایت فاتحانہ انداز میں لکھتی ہے کہ:۔

"جب بہت سے باغی گرفتار کر کے لائے گئے تو انہیں حکم دیا گیا کہ وہ گرجے کے فرش کو صاف کریں۔ مگر باوجودیکہ یہ لوگ اس قسم کا کام اپنے مذہبی معتقدات کے خلاف سمجھتے تھے۔ پھر بھی سنگین کی نوک سے انہیں اس حقیر کام کے کرنے پر مجبور کیا گیا۔ اُن میں سے بعض آدمیوں نے نہایت پھرتی سے اس کام کو سرانجام دیا محض اس خیال سے کہ شاید پھانسی کی سزا سے بچ جائیں گے۔ لیکن بے سود۔ کیونکہ وہ سب کے سب پھانسی پر لٹکا دیئے گئے" لہ

مجینڈی پھر لکھتا ہے کہ:۔

"وہ رات ہم نے جامع مسجد پر پہرہ دیتے ہوئے بسر کی۔ اور ہمارا زیادہ تر وقت ان قیدیوں کو گولی سے اڑا دینے یا پھانسی پر لٹکانے میں گزرتا تھا۔ جن کو ہم نے صبح کے وقت گرفتار کیا تھا۔ ان میں سے بہت سے بیچارے تو اسی جگہ ختم ہو گئے۔ لیکن آخر وقت تک اُن کے چہروں سے شجاعت اور ضبط کے آثار ہویدا تھے۔ جو اس سے کسی بڑے مقصد کے شایان شان علامات تھیں" ٢ہ

دہلی پر قبضہ کرنے سے پیشتر ایک افسر نے لکھا کہ:۔

لہ A lady's Escape from Gawaliar, P. 243.

٢ہ P. 205.

"باغی ہتھیار رکھنے کا ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ اس لئے کہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ انگریزوں کے ہاتھ گرفتار ہو کر موت کی سزا ملنی یقینی ہے اور نہ ہی اس کے سوا انہیں اور کوئی امید رکھنی چاہیئے تھی"[1]

میجر ریناڈ (RENAUD) کو جب وہ ہراول فوج کا ایک دستہ لیکر کانپور کے محصورین کی امداد کے لئے روانہ ہو رہا تھا۔ ذیل کی ہدایات جنرل نیل (NEILL) کی طرف سے موصول ہوئیں:۔

"بعض دیہات کو ان کی مجرمانہ حرکات کی بنا پر عام تباہی کے لئے منتخب کر دیا گیا ہے۔ جہاں کی تمام مرد آبادی کو قتل کر دینا ہوگا۔ باغی رجمنٹوں کے تمام ایسے سپاہی فی الفور پھانسی پر لٹکا دیئے جائیں جو اپنے چال چلن کے متعلق اطمینان بخش ثبوت بہم نہ پہنچا سکیں۔ قصبہ فتحپور کی تمام آبادی کو محاصرہ میں لیکر تہ تیغ کر دیا جائے۔ کیونکہ اس قصبہ نے بغاوت میں حصہ لیا ہے۔ باغیوں کے تمام سرغنوں اور بالخصوص فتحپور کے تمام سرغنوں کو فی الفور پھانسی دے دی جائے۔ اور اُن کے سر کاٹ کر وہاں کی سب سے بڑی عمارت پر لٹکائے جائیں"[2]

بیگم اودھ نے ۱۸۵۸ء میں نہایت ہی مایوسانہ وقار کے ساتھ اپنے

---

[1] Times, 24th October 1857, Montgomery Martin,

[2] Kaye, Book V chapter ii

ایک اعلان میں لکھا کہ :-

"کسی شخص نے کبھی خواب میں بھی یہ نہیں دیکھا کہ انگریز نے کبھی کسی مجرم کو معاف کیا ہو" [1]

آخر کار اس مسلسل اور بے تحاشا قتل و غارت کو روکنے کیلئے نہ صرف لارڈ کیننگ بلکہ جان لارنس نے بھی پوری کوشش کی اور مسٹر ڈزرالی (Desraeli) وزیر اعظم انگلستان نے تو پہلی دفعہ اس دردناک واقعہ کے متعلق جرأت کے ساتھ اظہار خیال کیا۔ اور اس وقت جبکہ وحشیانہ جذبات کی نمائش خوب دل کھول کر ہو رہی تھی۔ مسٹر موصوف نے ذیل کے الفاظ میں اپنی بیزاری اور ناپسندیدگی کا اعلان کیا۔ جو کسی غیر ملکی قوم کے افعال کے خلاف نکتہ چینی نہیں تھی، بلکہ اپنی ہی قوم کی دیوانگی اور بربریت کے خلاف آواز تھی :-

"جنگ کی تباہ کاریاں کسی تحریک کی شرمندہ نہیں ہوا کرتیں۔ چنانچہ جو تباہی اور بربادی اس وقت ہندوستان میں لڑائی کی وجہ سے رونما ہو رہی ہے اُس کے لئے کسی ترغیب کی ضرورت نہیں۔ مجھے یہ بتلایا گیا ہے کہ ہماری بری اور بحری فوجیں ایسا شدید انتقام لیں گی۔ جس کو دیکھنے کی تاب بھی کوئی انسان مشکل سے لا سکے گا۔ ان دنوں حالات جہانتک میری عاجزانہ رائے کا تعلق ہے۔ میں بلا توقف

---

[1] Montgomery Martin, rise & Progress of The Indian Mutiny, chapter XXVI

اس پالیسی سے بیزاری کا اعلان کرتا ہوں۔ کیونکہ میرے نزدیک تمام ذمہ دار افران کا یہ فیصلہ نہایت ہی مکروہ ہے کہ آئندہ کیلئے انگلستان اپنے معاملات اور مناقشات کے تصفیہ کے وقت انصاف سے آنکھیں بند کر کے انتقام کو ہی اپنا اصول قرار دے دے۔ میں ایک منٹ کے لئے اس اصول کو پسند کرنے کیلئے تیار نہیں ہو سکتا کہ آئندہ سے ایک انگریز بھی نانا صاحب جیسا ظالم و سفاک کہلایا جائے۔ میرے نزدیک یہ نہایت ہی ناپسندیدہ پالیسی ہے کہ ظلم کے مقابلے میں ویسا ہی ظلم روا رکھا جائے۔ کچھ عرصہ سے ایسی ہولناک اطلاعات سننے میں آئی ہیں۔ جن سے میں مجبوراً اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ غالباً اس زمانہ میں میری قوم کے مذہبی معتقدات میں زبردست تبدیلی واقع ہو گئی ہے یعنی میری قوم اب جناب مسیح علیہ السلام کی تعلیم سے منحرف ہو رہی ہے۔ اور اس کی بجائے پرانے یونانی دیوتا مولوک (Moloch) (قتل و غارت کا دیوتا) کی پرستش کی رسم کو از سر نو زندہ کرنے والی ہے۔[1]

لارڈ کیننگ اپنے ایک مراسلہ میں جو ملکہ وکٹوریہ کی خدمت میں بھیجا گیا تھا۔ یورپین قوم کی طبائع پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

---

[1] Life by buckle, IV, P. 98-99 speech at Newport Pagnel, 30-9-1857.

"ہماری قوم کے دماغ میں ایک عالمگیر دیوانگی اور انتقام کا جذبہ موجزن ہے۔ چنانچہ اس میں وہ بزرگ بھی شامل ہیں جن سے بہتر طرز عمل کی توقع تھی۔ ایسی گری ہوئی ذہنیت کو دیکھ کر ناممکن ہے کہ ان کے ہم قدم ساتھیوں کی گردنیں ندامت اور شرمندگی سے نہ جھک جائیں۔ کیونکہ ہر دس آدمیوں میں سے ایک بھی تو ایسا دکھائی نہیں دیتا۔ جو چالیس یا پچاس ہزار انسانوں کے بیدریغ قتل و پھانسی کو ضروری اور صحیح نہ سمجھتا ہو۔"

جس کا جواب ملکہ معظمہ نے ذیل کے الفاظ میں دیا۔

"لارڈ کیننگ نہایت آسانی سے یقین کریں گے کہ نہ صرف اُن غیر مذہبی افعال کے ارتکاب سے جن کا اشارہ لارڈ موصوف نے اپنے مراسلہ میں کیا ہے بلکہ عام طور پر جس سرد مہری کا اظہار ہندوستانی حوادث کو پس پشت ڈال کر انگلستان کی پبلک نے دیا ہے۔ ملکہ معظمہ دلی بیزاری کا اظہار کرتی ہے اور لارڈ موصوف کے ساتھ دلی رنج اور افسوس کے احساسات میں برابر کی شریک ہے"

لیکن بدقسمتی سے لارڈ کیننگ اپنے جذبات کو عملی جامہ پہنانے میں ہمیشہ کمزور ثابت ہوئے۔ یعنی ان کے افعال ہمیشہ ان کے اعلےٰ جذبات کے مطابق نہیں ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ فوجی عدالتوں اور سپیشل کمشنروں کے تشدد اور ظلم کا ذکر کرتے ہوئے سر جارج کیمپبل (Sir George Campbell) لکھتا ہے کہ:-

"میں نے متعدد دفعہ مارشل لاء کا ذکر سنا ہے اور اکثر دفعہ طاقتور لوگوں کو اس کے نفاذ کی ضرورت کا مطالبہ کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ لیکن میں آجتک اس کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔ سوائے اس کے کہ ایک فوجی سپاہی کو اختیار دیا جائے کہ وہ جس کو چاہے جان سے ہلاک کر دے یا کسی کی جائداد پر قبضہ کرے۔ یا ایسا ہی کوئی اور ظلم روا رکھے جو اس کے دماغ میں آئے۔ میرے نزدیک تو مارشل لاء یا فوجی قانون کے یہی معنی ہیں۔ اگرچہ صاف طور پر الفاظ میں اس کی تشریح نہیں کی جاتی"

چنانچہ "جب ۶۔ جون ۱۸۵۷ء کو لارڈ کیننگ کی گورنمنٹ نے بعض صوبوں میں مارشل لاء جاری کرنے کا اعلان کر دیا تو اس کے بعد حکومت کا یہ فرض تھا کہ آنکھیں کھول کر ان خطرناک اختیارات کے استعمال کی پوری پوری نگرانی کرتی۔ مگر افسوس کہ اس طرف کوئی دھیان بھی کیا گیا۔ یہ ایک ایسی انتظامی ناقابلیت ہے جو کبھی بھی معاف نہیں کی جا سکتی۔ اگرچہ ذاتی خوبیوں اور اعلےٰ کیریکٹر کے لحاظ سے لارڈ کیننگ کی شخصیت ہر ستائش اور تعریف کی مستحق ہے۔ بایں ہمہ اس غفلت کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ رحم اور انصاف کے اعلےٰ اصول تو ایک ردی کاغذ کی حیثیت سے ایک طرف ڈال دیئے گئے۔ اور ان کی جگہ فوجیوں نے خوب دل کھول کر نہایت وحشیانہ طریق پر بیدریغ خون کی ندیاں

بہائیں۔ یہاں تک کہ اس تمام مکروہ طرزِ عمل میں فوجی قانون کا نمائشی استعمال بھی نہیں کیا گیا" ؎۱

باغیوں کو نیست و نابود کرنے کیلئے قتل و غارت کا جو بازار ہم نے گرم کیا تھا۔ اس میں نہ تو فوجی سپاہیوں کی کوئی تمیز روا رکھی گئی اور نہ ہی اودھ کے غریب باشندوں کی۔ چنانچہ سر جارج کیمپبل اس پر بحث کرتے ہوئے ایک نیا سوال پیش کرتا ہے کہ:۔

"اگرچہ یہ صحیح ہے کہ باغی سپاہیوں پر ایک قسم کا جنون مسلط تھا لیکن پھر بھی وہ انسان تھے۔ اور ہمارے نمک خوار ہوتے ہوئے بھی ہمارے خلاف نہایت وحشیانہ طریق سے بغاوت پھیلائی اور لڑائی کی۔ یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسے وقت میں جب بغاوت کی آگ چاروں طرف سے پھیل چکی تھی۔ اور ہماری طاقت بھی بظاہر کمزور نظر آتی تھی۔ تو ایسے میں یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ ہندوستان کی تمام رعایا ہمارے ساتھ وفادار رہے گی۔ ذرا خیال کیجئے کہ وہ ہماری ہم قوم بھی نہیں تھی۔ کیا اس کے یہ معنے ہیں کہ ہم اُن تمام اشخاص یا جماعتوں کو اخلاقی طور پر مجرم سمجھیں جنہوں نے یہ سمجھ کر کہ اب ہمارا چراغِ حکومت ٹمٹما رہا ہے۔ اپنے تحفظ کیلئے علیحدہ انتظام کرنا شروع کر دیا۔ حیرت تو یہ ہے کہ ایسے نازک حالات نے بہت کم لوگ کیوں متاثر ہوئے۔ یہ صحیح ہے

؎۱ Memories of Indian career, I, P. 232

کہ غدر کے اعلان کے بعد سپاہیوں نے ہر اُس انگریز کو جو اُن کے ہتھے چڑھا۔ بے دریغ قتل کر دیا۔ یعنی مشکل سے کوئی ایسا خاص واقعہ نظر آئے جہاں کوئی خوش قسمت انگریز باغی سپاہیوں کے ہاتھ سے بچ نکلا ہو۔ اس کے مقابلہ میں سول رعایا نے عام طور پر ہمارے آدمیوں کو پناہ دی اور اپنے آپ کو جوکھوں میں ڈال کر انگریزوں کی جان بچانے میں امداد کی۔ شاید ہی کوئی ایک آدھ ایسا واقعہ ملے۔ جہاں سول رعایا کے ہاتھوں کوئی انگریز قتل کیا گیا ہو" [1]

سرجان کیمبل کے مقابلہ میں ایک معمولی دماغ کے انگریز افسر کو بھی یہی خیال سوجھا تھا۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ:۔

"میرے خیال میں اس لڑائی کا سب سے زیادہ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ مجرموں کے مقابلہ میں معصوم اور بیگناہ انسانوں کو زیادہ اذیتیں برداشت کرنی پڑیں۔ چنانچہ بزدل باغیوں کے ہاتھ بیگناہ عورتوں اور بچوں کے خون سے رنگے ہوئے تھے اور اودھ کے غریب دیہاتیوں کے درمیان انتقام لیتے وقت کوئی تمیز نہیں کی گئی۔ اگرچہ موخر الذکر کے خلاف بھی کسی قدر ناانصافی یا لوٹ مار کا شبہ کیا جاتا تھا۔ پھر بھی یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ وہ بغاوت کے مرتکب نہیں ہوئے۔ زیادہ سے زیادہ

---

[1] Memoires of my Indian career, I, P. 233.

اُن کے خلاف یہ کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے بغاوت سے فائدہ اٹھا کر اپنے ملک کو غیر ملکیوں کے ہاتھوں سے آزاد کرنے کی کوشش کی۔ اب رہا یہ امر کہ ان کا یہ طرزِ عمل درست تھا یا غلط۔ تو یہ ایک دوسرا سوال ہے انہوں نے تو اپنے تئیں حق بجانب سمجھ کر اپنے وطن کو آزاد کرنے کے لئے کوشش کی۔ اس لئے ہم اس جذبے کو تو بُرا نہیں کہہ سکتے چنانچہ ہمارے حق میں یہ زیادہ مفید اور تسلی بخش ہوتا۔ اگر ہم سپاہیوں کو چھوڑ کر اودھ کے باشندوں کی جان بخشی کر دیتے اور ایسی دردناک سزائیں نہ دیتے"[1]

ذیل کے مضمون میں مسٹر رسّل RUSSEL اس سوال کی مزید وضاحت اس طرح کرتا ہے کہ:۔

"یا تو یہ صرف فوجی بغاوت تھی اور یا سپاہیوں کے بغاوت کرنے کے بعد عام لوگوں نے کم و بیش اس کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔ اگر ہم اس کو فوجی بغاوت تسلیم کرتے ہیں تو پھر یہ صریح ناانصافی اور زیادتی تھی کہ سول رعایا کو محض اس جرم پر کہ انہوں نے سپاہیوں کی امداد کیوں کی۔ جرمانے اور پھانسی کی شدید سزائیں دی گئیں، حالانکہ یہ بھی ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں ان کی شمولیت کو کبھی بھی ارادۃً نہیں کہا جا سکتا۔ بلکہ یہ جبریہ امداد شمار

---

[1] Majendie, P. 195.

کیجائیگی۔ دوسری طرف اس جرم پر سول رعایا کو ہولناک سزائیں دینا کہ انہوں نے نہتے ہونے کے باوجود مسلح باغی سپاہیوں کا مقابلہ کیوں نہ کیا۔ سیاسی نقطۂ نظر سے یہ ایک فاش غلطی ہے محض ہمدردی کا اظہار کسی کے مجرم ہونے کی دلیل نہیں بن جاتا۔ چنانچہ اس طرح بے دریغ سزائیں دینے کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ ہندوستانیوں کے دلوں میں ہمارے خلاف نفرت و بغض کے جذبات پیدا ہو جائیں۔ جو آخر کار ترقی کر کے نسلی منافرت کی شکل اختیار کر لیں گے باغیوں کو میدان جنگ میں لڑتے ہوئے تنا کے گھاٹ اُتارنا کبھی بھی زیادتی سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے کہ دشمن کو ہمیشہ کھلی لڑائی ہی میں ختم کرنا چاہیئے۔ یقیناً ہمیں اُن سنگدل دغا بازوں کو بیدریغ قتل کرنا چاہیئے۔ جنہوں نے اپنے افسروں کو قتل کر کے ان کے بچوں اور عورتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے مار ڈالا تھا۔ لیکن یہ تو انسانیت اور انصاف کے خلاف ہے کہ تمام اضلاع کو ہی تاخت و تاراج کیا جائے۔ محض اس جرم پر کہ باغیوں نے ان علاقوں میں پڑاؤ کیا تھا۔ غدر کے مصائب اور تباہ کاریوں نے فریقین کے دلوں میں بغض و عداوت کے جذبات اس حد تک پیدا کر دیئے ہیں۔ کہ صرف حکومت کے نام کی تبدیلی ہی اس تلخ یاد کو مٹانے میں کامیاب ثابت نہیں ہو سکے گی۔ اگرچہ بظاہر اس تبدیلی کی خواہش کو کتنا ہی

مفید کیوں نہ خیال کیا جائے۔ لیکن اتنی خونریزی کے بعد اور دلوں میں اس قدر گہری عداوت کے راسخ ہو جانے کے بعد ایسی حرکت فی الفور مقبول اور پسندیدہ نہیں ہو سکے گی۔ ان ہولناک واقعات کی یاد کو محو کرنے کیلئے غالباً کئی سو سال درکار ہونگے۔ لیکن باہمی اعتماد کی کیفیت تو میرے خیال میں کبھی پیدا نہیں ہو گی "[۱]

(۱۰)

فریڈرک کوپر (Frederick Cooper) ڈپٹی کمشنر امرتسر نے اس سلسلہ میں اپنی ایک خاص مہم کے واقعات کو ایک کتاب کی شکل میں ترتیب دیا۔ جس سے اُس کا مقصد اپنی قوم سے ایک لازوال شہرت حاصل کرنا تھا۔ چنانچہ ۲۸۔ ستمبر ۵۷ء کو لنڈن کی وزارتِ خارجہ۔ نے اس خاص مہم کا ذکر اپنے ایک اعلان میں ذیل کے الفاظ میں کیا ہے کہ :۔

"تیس ۳۰ جولائی کو لاہور میں ہندوستانی پیادوں کی پلٹن نمبر ۲۶ نے بغاوت کر کے اپنے کمانڈار افسر میجر سپنسر (Spencer) کو قتل کر دیا۔ جس کی پاداش میں باغیوں کو بیدریغ قتل کر دیا گیا"۔ حفاظتی تدابیر کے سلسلہ میں ۱۳ مئی کے دن تین ہزار آٹھ سو (۳۸۰۰) ہندوستانی سپاہیوں کی پلٹنیں رات اور دن اُن

---

[۱] Diary, II, P. 259.

کی نقل و حرکت کی نگرانی کرتی رہیں۔ ۳۰۔ جولائی کے دن جبکہ آندھی نہائت زور سے چل رہی تھی تو یکایک ان سپاہیوں کے درمیان گھبراہٹ ظاہر ہوئی۔ جس سے انگریز افسران یہ سمجھے کہ یہ گھبراہٹ آندھی کے طوفان کے ڈر سے پیدا ہوئی ہے:۔

"یہ نہیں کہا جا سکتا کہ جب اُن سے ہتھیار چھین لیئے گئے تھے تو یہ گھبراہٹ موجودہ ذلیل زندگی کو خیرباد کہنے کیلیے پہلے سے طے شدہ سازش کا اعلان تھا۔ یا نہیں۔ البتہ پرکاش سنگھ نامی ایک مذہبی دیوانہ یکایک ننگی تلوار کو ہلاتا ہوا اپنی جھونپڑی سے باہر کی طرف تیزی سے بھاگا اور اپنے ساتھیوں کو للکارتا گیا کہ وہ اٹھیں اور فرنگیوں کو نیست و نابود کر دیں۔"

اُس نے یعنی پرکاش سنگھ نے میجر کو قتل کر دیا۔ جس کے بعد نمبر ۲۶ ہندوستانی پلٹن آندھی کے طوفان کے درمیان ہی وہاں سے بھاگ نکلی لیکن اُن میں سے جتنے لوگ باقی رہ گئے۔ ان کو چھاؤنی میں ہی سکھوں اور گوروں کی توپوں نے ڈھیر کر دیا۔ مفرورین کی اس جماعت نے دوسرے دن دریائے راوی کو عبور کرنے کی کوشش کی۔ لیکن پولیس کی بروقت مخالفت سے وہ اس مقصد میں ناکام رہے۔ یہانتک کہ مسٹر کوپر (Cooper) امرتسر سے اُن کا تعاقب کرتا ہوا وہاں پہنچا اور جو کیفیت اُس نے وہاں دیکھی وہ اپنے الفاظ میں یُوں بیان کرتا ہے:۔

"دیہاتیوں کی ایک بڑی جماعت دریائے راوی کے کنارے جمع تھی۔ جن کے چہرے اس لئے خوشی سے چمکتے تھے کہ وہ باغیوں کو آسانی سے پسپا کرنے میں کامیاب رہے تھے۔ چنانچہ ڈیڑھ سو آدمی تو گولیوں سے ہلاک ہو گئے اور ایک کثیر تعداد کو دوبارہ دریا عبور کرنے پر مجبور کیا گیا۔ جن میں سے بیشتر حصہ دریا میں ڈوب کر ہلاک ہو گیا۔ لیکن باغیوں کی ایک بہت بڑی تعداد دریا کے اوپر کی طرف بھاگ گئی۔ جہاں کہ وہ لکڑیوں کے تختوں کے ذریعہ تیرنے میں کامیاب ہو گئی۔ اور بعض ایک میل کے فاصلے پر ایک جزیرے پر اترنے میں کامیاب ہو گئے جہاں پر دور سے وہ جنگلی مرغوں کی طرح بیٹھے ہوئے نظر آتے تھے۔ اب صرف یہ باقی رہ گیا تھا کہ اس جماعت کو محاصرہ کر کے گرفتار کر لیا جائے۔ جس کے بعد ایسی شدید سزا دی جائے جو دوسروں کے لئے عبرت ہو۔"

اب مسٹر کوپر (Cooper) کے راستے میں ایک عجیب وغریب عملی مشکل حائل تھی۔ جو بالکل اس شخص کی ناگفتہ بہ حالت سے مطابقت رکھتی تھی۔ جو ایک لومڑ، ایک بطخ اور ایک بوری غلہ کے ساتھ دریا کے کنارے ایسے وقت پر پہنچتا ہے۔ جب وہاں پر عبور کرنے کیلئے کوئی کشتی وغیرہ نہیں ہوتی۔ ایسی حالت میں اگر وہ پایاب عبور کرنا چاہے تو وہ نہ تو بطخ اور لومڑ کو اکٹھا پیچھے چھوڑ سکتا ہے کیونکہ اندیشہ ہے کہ اپنی پشتینی دشمنی کی بنا پر ایک دوسرے پر

حملہ آور نہ ہوں - اور نہ ہی بلطخ اور نخلے کو جس سے غلّے کے نقصان کا احتمال ہے - غرضیکہ وہ ان میں سے کسی طرح بھی کسی ڈنڈ کو پیچھے چھوڑ نہیں سکتا - اور وہاں پر رات کے وقت قیام بھی نہیں کر سکتا - بعینہٖ سکھوں اور مسلمانوں کی دیرینہ عداوت کے بھڑکنے کے خیال سے نیز اپنے طریق سے باغیوں کو ختم کرنے کی خواہش کو مدنظر رکھتے ہوئے اُس نے اپنے آپ کو اس مخمصے میں گھرا ہوا پایا۔ چنانچہ مذاقیہ رنگ میں اُس نے اس کہاوت کو سپاہیوں کو سنایا۔ جس کا اثر یہ ہوا کہ وہ اُن کے خیالات کو بہت حد تک تبدیل کرنے میں کامیاب رہے - القصہ اس نے ایک عملی آدمی کی حیثیت سے موقع کے مناسب حالات پر پورا قابو حاصل کر کے اپنے حسب منشاء کارروائی کی - جس کا ذکر وہ اپنے الفاظ میں اس طرح کرتا ہے کہ:-

"باغیوں کی قسمت کو بدلنے کیلئے قدرت اور اتفاقات حسنہ نے ہمارا ساتھ دیا - کیونکہ اگر انہوں نے بھاگنے کیلئے کوئی حرکت کی ہوتی تو لازماً ایک ہولناک لڑائی شروع ہو جاتی - لیکن شکر ہے کہ انہوں نے ایسا نہ کیا - بلکہ قدرت نے ان کے دماغ میں خاموش رہنے کا خیال ایسا ڈال دیا جو بالکل ہمارے حق میں تھا - سورج کی سنہری کرنیں پوری روشنی کے ساتھ چمک رہی تھیں - جب ہم نے دو کشتیوں پر سپاہ کو بھیجا - جن کی سنگینوں اور پستولوں کی چمک سے خائف ہو کر تمام باغی سمٹ کر دو نو

ہاتھ سینوں پر باندھے ہوئے ساحل کی طرف پوری خاموشی اور عاجزی کے ساتھ بڑھے۔ اگرچہ ان میں سے بعض نے چھلانگیں ماریں لیکن فی الفور سنگینوں کا رُخ پھیر دیا۔ وہ بھی ایک عجیب بھیانک نظارہ تھا جبکہ اُن کے لمبے لمبے عکس پانی پر سُورج کی کرنوں سے پڑتے دکھائی دیتے تھے۔ لیکن سواروں کو چونکہ حکم دیا گیا تھا کہ کسی آدمی کو گولی سے نہ مارا جائے اس لئے اُن احمقوں نے یہ سمجھا کہ مسٹر کوُپر کا منشا اُن کو جان سے مارنے کا نہیں بلکہ اُن کے خلاف باقاعدہ مقدمے چلائے جائیں گے۔ جس کے لئے اُنہیں کھانا کھلا کر فوجی عدالت کے روبرو پیش کیا جائے گا۔ چنانچہ اس غلط اُمید کے بھروسے پر چھتیس تنومند جوانوں نے اپنے آپ کو ایک ہی شخص کے ہاتھ سے بندھوانے کیلئے خاموشی سے پیش کر دیا اور اس ذلت کو پسند کیا کہ انہیں کشتی کے ایک گوشے میں بکریوں کے ریوڑ کی طرح ایک دوسرے کے اوپر پھینک دیا جائے"۔

آدھی رات تک دو سو بیاسی (۲۸۲) آدمیوں کو قید کر کے کوتوالی کے ایک بُرج میں بند کر دیا گیا۔ ان کے علاوہ باغیوں کی کافی تعداد کو دیہاتیوں کے رحم پر چھوڑ دیا گیا۔ جن کے انجام کے متعلق تاریخ کے صفحات آج تک خاموش ہیں کہ دیہاتیوں نے اُن کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ چونکہ اُسی رات بارش ہو گئی تھی۔ اس

لئے پھانسیوں کو دوسرے دن پر اُٹھا دیا گیا۔ لیکن مسٹر کوُپر (COOPER) جیسا مذہبی جذبات کا دلدادہ انسان ایسے موسم کی افسردہ خوبصورتی کے اظہار تک سے پہلو تہی نہیں کرتا۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ :۔

"فرحت و تازگی بخشنے والا چاند اپنی خوبصورت اور مختلف النوع روشنی سے بادلوں کو چیر کر نکلا اور تمام فضا کو جگمگ جگمگ کر دیا۔ گویا کہ وہ قیدیوں کے نوشتے کو جلا دے رہا تھا"

دوسرے دن علی الصبح سکھوں کا ایک دستہ رسّے لیکر پہنچ گیا۔ جو درختوں کی کمی کی وجہ سے استعمال نہ کئے گئے۔ بہر حال مسلمان باغیوں کو نیست و نابود کرنے میں سکھوں نے مسٹر کوپر (Cooper) کا ہاتھ اچھی طرح بٹایا۔ اگرچہ اسے اندیشہ تھا کہ شائد سکھ باوجود وفادار ہونے کے اس حد تک اذیت پہنچانے میں کامیاب نہ ہوں جس طرح کہ مسٹر کوُپر چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ :۔

"پہلی اگست کو بقر عید کے تیوہار کا دن تھا جسے مسلمان ہر سال جانوروں کی قربانی کر کے نہایت دھوم دھام سے منایا کرتے ہیں۔ اس لئے مسلمان سواروں کو وہاں سے علیحدہ کرنے کے لئے یہ ایک مفید عذر تھا۔ چنانچہ ان کو اس تیوہار کے منانے کے لئے امرتسر بھیج دیا گیا۔ اور صرف ایک عیسائی افسر وفادار سکھوں کی امداد سے ایک مختلف قسم کی قربانی کرنے کیلئے وہاں پر اکیلا"

رہ گیا - جو مطلقاً نہ گھبرایا بلکہ پورے حوصلے اور جرأت سے اس کام کو بخوبی سرانجام دیا - اب مشکل یہ پیش آئی کہ لاشوں کو کس طرح دبایا جائے تاکہ وہاں کے رہنے والوں کی تعفن (بدبو) سے صحت خراب نہ ہو - لیکن قدرت نے پھر ہماری امداد کی - یعنی اتفاق سے قریب ہی ایک ویران کنواں مل گیا - جس سے اس مشکل کا حل بھی نکل آیا"

قیدیوں کو بازوؤں سے پیچھے کی طرف باندھ کر دس دس کی ٹولیوں میں میدان میں گولی سے اڑا دینے کیلئے باہر گھسیٹا گیا - اپنی قسمت کے انجام کے متعلق سنکر اُن کے غم و غصہ کی کوئی انتہا نہ رہی جس کا نقشہ وہ اس طرح کھینچتا ہے کہ :-

"جب تقریباً ڈیڑھ سو باغیوں کو اس طرح گولی سے اڑا دیا گیا، تو قتل کرنے والوں میں سے ایک شخص غش کھا کر گر پڑا جو ہلاک کرنے والوں میں سے سب سے بوڑھا سپاہی تھا - اس لئے آرام کرنے کیلئے تھوڑا سا وقفہ دیا گیا - چنانچہ اس کے بعد قتل کی کارروائی کو دوبارہ شروع کیا گیا اور جب تعداد دو سو سینتیس (۲۳۷) تک پہنچ گئی تو ایک افسر نے اطلاع دی - کہ باقی باغی برج سے باہر آنے سے انکار کرتے ہیں جہاں کہ وہ چند گھنٹے عارضی طور پر پہلے سے بند کر دیئے گئے تھے - اس پر برج کے دروازے کھولے گئے تو معاً ایک نہایت ہی دردناک

نظارہ دیکھنے میں آیا۔ جس سے ہالول کے بلیک ہول HOLWELL's BLACK HOLE کی تلخ یاد دوبارہ تازہ ہوگئی۔ یعنی پینتالیس انسانوں کی مردہ لاشیں باہر لائی گئیں۔ جو خوف، گرمی، سفر کی صعوبت اور ورم کے گھٹنے کی وجہ سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر ہلاک ہو گئے تھے "!

اِن مُردہ اور نیم مُردہ لاشوں کو اپنے مقتول ساتھیوں کی لاشوں کے ساتھ گاؤں کے بھنگیوں کے ہاتھوں قریب کے ویران کنوئیں میں پھنکوا دیا گیا۔ کوپر Cooper اس رُوح فرسا حادثہ کو حق بجانب ثابت کرنے کیلئے لکھتا ہے کہ:۔

"متذکرہ صدر حادثہ کے حالات جو خود میری اپنی قلم سے لکھے گئے ہیں۔ میرے ہموطنوں کو یقیناً حیرت در استعجاب میں ڈال دیں گے۔ کہ کس طرح ایک انگریز نے تن تنہا چند ایشیائی سپاہیوں کی مدد سے اتنی بڑی خطرناک ذمہ داری کو اُٹھا کر اس قسم کی یادگار زمانہ قتل و غارت کو نہایت سنگدلی سے ہوتے ہوئے دیکھا۔ جبکہ فریقِ مخالف کی طرف سے نہ تو کھلی جنگ کی گئی جس سے طبائع جوش میں آکر قتل و غارت کرنے کیلئے اُبھرتیں اور نہ ہی کسی ایک فرد واحد کو کوئی زخم پہنچایا گیا۔ جس کی بناپر اس قسم کی شدید منتقمانہ کارروائی کی ضرورت لاحق ہوتی۔ لیکن ایسے

اصحاب کو واضح ہونا چاہیئے کہ پنجاب کے گورنران صحیح انگریزی کیریکٹر اور خصلت کے مالک ہیں۔ اسی لئے لارڈ نیلسن (Lord Nelson) کی طرح وہ اپنے سٹاف سے متوقع ہیں کہ خطرے کے وقت ہر ایک شخص انگلستان کے لئے اپنا فرض انجام دیگا۔ جس کی بجا آوری کے بعد گورنر کی طرف سے ہر ایک کا دلی شکریہ ادا کیا جاتا ہے"۔

کتاب کے مقدمہ میں بھی کوپر Cooper نے اسی خیال کا اظہار کیا ہے۔ چنانچہ اس کتاب کے لکھنے کا مقصد جہاں یہ بتانا تھا۔ کہ کس طرح انگریز پنجاب میں حکومت کرتے ہیں۔ وہاں یہ بھی ظاہر کرنا تھا کہ :۔

"عیسائیت کے فروغ کے لئے خداوند یسوع مسیح کی روشن و ظاہر امداد اور برکت کے مقابلے میں انسانی شجاعت اور دانائی کوئی حقیقت نہیں رکھتی"۔

یہی کتاب کے خاتمہ پر وہ لکھتا ہے کہ :۔

"اُن انسانوں کے لئے جو ظاہری نشانات سے مستقبل کے متعلق فال لینے کے عادی ہیں۔ ہم دہلی کے عیسائی گرجے کی صلیب کے نشان کیطرف توجہ دلاتے ہیں کہ اگرچہ وہ گولی جس پر صلیب کا نشان کھڑا کیا گیا ہے باغیوں کی چاند ماری سے چھلنی ہو چکی ہے لیکن صلیب کے نشان کو کسی قسم کا گزند نہیں پہنچا وہ اسی طرح سالم کا سالم اپنی پہلی حالت پر موجود نظر آتا ہے جسکے تمثیلاً یہ معنے ہیں کہ عیسائیت نے تمام دنیا پر غلبہ حاصل کر لیا ہے"۔

یہ صحیح ہے کہ کتاب کے کچھ عرصہ بعد:۔

"کوپر Cooper پر بھی جاہلانہ انسانی ہمدردی کے رنگ میں تمام دنیا کی طرف سے متواتر شدید حملے کئے گئے کہ کیوں اس نے از خود اتنے اہم اور ضروری امور میں خود سرانہ طرز عمل اختیار کیا" [1]

یہ بھی صحیح ہے کہ اگرچہ شروع میں اُس کے افعال کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد یہ جوش ٹھنڈا پڑ گیا اور ہندوستان میں بھی سوالات اور اعتراضات کی بارش ہونی شروع ہو گئی۔ یہاں تک کہ ہمارے مورخین نے مجبوراً کوپر کی حرکات اور زیادتیوں کے متعلق مکمل خاموشی کو ہی مناسب سمجھا۔ لیکن اُس وقت جس بے چینی سے وہ اعلیٰ افسران کی خوشنودی کا انتظار کر رہا تھا۔ بالآخر وہ وقت آ ہی پہنچا۔ چنانچہ جان لارنس John Lawrence نے اس کی حرکات کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہوئے ذیل کے الفاظ میں اپنی خوشنودی کا سارٹیفیکیٹ بھیجا:۔

"لاہور۔ مورخہ ۲۔ اگست ۱۸۵۷ء۔ میرے پیارے کوپر!

ہندوستانی پیادوں کی پلٹن نمبر ۲۶ پر جو فتح آپ نے حاصل کی ہے میں اس کامیابی پر آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔ آپ نے اور آپ کی پولیس نے نہایت جرأت اور دلیری سے باغیوں کی سرکوبی میں حصہ لیا۔ جس کے لئے حکومت آپ کی مشکور ہے۔ مجھے یقین ہے کہ باغیوں کی سزایابی دوسروں کے لئے عبرت کا

---

[1] T.R.E. Holems, The Indian mutiny (4th Edition) P. 353.

باعث ہوگی۔ نیز توقع ہے کہ تمام ایسے افراد کو قابو میں لانے کی جملہ تدابیر پر عمل کیا جائے گا۔ جو اس وقت تک مفرور ہیں۔"

رابرٹ مونٹ گمری (Robert Montgomery) نے ذیل کا خط مسٹر کوپر کے نام لکھا۔ جبکہ وہ لارنس کے بعد پنجاب کا لفٹننٹ گورنر مقرر کیا گیا۔

"آپ نے نہایت درست قدم اٹھایا جس کے لئے آپ کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے ایسے نازک وقت میں سوچنا یا دیر کرنا یا واپس لوٹنا کوئی فائدہ نہیں دیا کرتا۔ جبتک کہ تم زندہ ہو یہ کامیابی ایک قیمتی موتی کی طرح تمہاری کلاہِ افتخار پر چمکتی رہے گی۔ یہاں پر بھی باقی تین پلٹنیں کسی قدر مذبذب تھیں۔ لیکن اب مجھے یقین ہے کہ وہ کوئی ایسی حرکت نہیں کریں گی۔ حالانکہ میری دلی خواہش ہے کہ وہ ضرور ایسی کوئی حماقت کریں تاکہ ان میں سے ایک بھی سپاہی کو زندہ نہ چھوڑا جائے۔"

ہندوستان میں مسیحیت کی تبلیغ کی حمایت کرنے والوں میں سے منٹگمری Montgomery بھی ایک زبردست حامی تھا۔ مجھے یقین نہیں کہ ایسے خیالات رکھنے والے انسان کی متذکرہ صدر چھٹی پر قرار واقعی تبصرہ ہو سکے۔ غدر کے بعد اُس نے لارنس کو لکھا کہ:۔

ہندوستانی سلطنت کو انگلستان کے لئے یا انگلستان کو ہندوستان کیلئے محفوظ رکھنے میں نہ تو ہماری پالیسی یا سپاہی یا افسران کی

بہادری اور استقلال نے امداد کی۔ بلکہ یہ سب کچھ ہمارے پروردگار

کی عنایت سے ظاہر ہوا جس کی توجہ ہمیشہ ہمارے ساتھ رہی" [1]

کوُپر کی اس کامیاب مُہم کے تھوڑا عرصہ بعد اُس نے ہوڈسن (Hodson) کو ایک ایسے فعل پر مبارکبادی کا خط لکھا۔ جس کی درندگی اور سفاکی کو کسی نے بھی پسند نہیں کیا۔ بلکہ اُن انگریز افسران نے بھی اس واقعہ کی قطعاً کوئی حمایت نہ کی۔ جنہوں نے غدر کی یادداشتیں مرتب کیں۔

"میرے پیارے ہوڈسن۔ بادشاہ کو گرفتار کرنے اور اس کے بچوں کے قتل کرنے پر تم اور تمہاری پلٹن ہر طرح کی مبارکباد کے مستحق ہو۔ مجھے امید ہے کہ آئندہ بھی ایسے معاملات میں ہمیشہ کامیاب رہو گے۔"

لیکن کوُپر کی سنگدلی کی کارروائی ابھی یہیں پر ختم نہیں ہوئی۔ اِن بدقسمت باغیوں میں سے ایک سپاہی اس قدر شدید زخمی تھا کہ وہ پھانسی دینے کے مقام پر پہنچ نہیں سکتا تھا۔ چنانچہ مسٹر مونٹ گمری کے مشورہ پر اس کی پھانسی کی سزا ملتوی کی گئی۔ تاکہ وہ وعدہ معاف گواہ کی حیثیت سے آئندہ مفید ثابت ہوسکے۔ چنانچہ اپنے مذہبی جذبات کی نمائش ذیل کے الفاظ میں کی ہے:۔

"زخمی سپاہی سے جس قدر حالات معلوم ہوسکیں قلمبند کر لیے

---

[1] Lord Lawrence, P. 114.

جائیں تاکہ وہ اس کے بعد لاہور پہنچکر باغیوں کا انجام اپنی زبان سے خود لوگوں میں بیان کرے۔ کیونکہ اندیشہ ہے کہ ہمارے ذریعہ سے مشتہر شدہ باتوں پر لوگ یقین نہیں کرینگے۔ آپ کو بعض ایسے باغی بھی یقیناً ملیں گے۔ جو اس وقت آوارگی کی زندگی بسر کر رہے ہوں گے۔ ان میں سے جتنے گرفتار ہو سکیں ہمارے پاس فی الفور بھیج دیئے جائیں کیونکہ لاہور سے باہر تم کافی خونریزی کر چکے ہو اور یہاں پر فوجیوں کے سامنے ایسی نمائش کی سخت ضرورت ہے۔ نیز جس طریق سے اس وقت تک سزائیں دی گئی ہیں۔ ان کے متعلق بھی لوگوں کو آگاہ کرنا لازمی ہے"۔

چنانچہ اس حکم کے ماتحت تمام زخمی اور اکتالیس کے قریب باغیوں کو دیہاتوں سے تلاش کر کے لاہور بھیجدیا گیا۔ جہاں ان کو فوجوں کے سامنے توپوں سے باندھ کر اُڑا دیا گیا۔ کوپر کے الفاظ ہیں "نمبر ۲۶ پلٹن کو قرار واقعی سزا دی گئی اور سب کی سب تباہ کر دی گئی" پھانسیوں کے متعلق اخبار ٹائمز لکھتا ہے کہ:۔

"بغاوت کے اعلان کے اڑتالیس گھنٹوں کے اندر اندر پانچسو آدمیوں کو قانون کی رو سے سزا دی گئی۔ قارئین یہاں پر بجا طور پر سوال کریں گے کہ ان کا جرم کیا تھا اور کس قانون کے ماتحت اس قدر کثیر تعداد کو پھانسیاں دی گئیں۔ حالانکہ اس وقت کے ذمہ دار حکام کی اپنی رپورٹوں سے یہ تصدیق ہو چکی ہے کہ باغی بالکل نہتے تھے

اور طوفان سے ڈر کر بھاگ نکلے تھے۔ نیز محاصرے کے وقت بھوک اور مسافت کی تکلیف اور صدمے سے اُن کی حالت نیم مردہ انسانوں کی تھی"[1]

مسٹر گریدھڈ Greathed جو محاصرین کے ساتھ سول کمشنر کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ لکھتا ہے کہ:-

"دو انگریزوں کے قتل کے عوض پانچسو باغیوں کی جان لینا ایک ایسا خوفناک بدلہ ہے جو کبھی فراموش نہیں ہو سکے گا"[2]

ہاں! یہ بالکل درست ہے کہ جس طرح کانپور کا حادثہ انگلستان کے لئے ناقابلِ فراموش ہے۔ اسی طرح اس خونی انتقام کی یاد بھی ہندوستان کے دماغ سے کبھی محو نہیں ہو سکے گی۔ چنانچہ اس سفاکی کی انتہا ہو جاتی ہے۔ جب ہم کوپر کے ذیل کے الفاظ کو پڑھتے ہیں جو اس نے اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے لکھے:-

"ایک کنوئاں تو کانپور میں ہے۔ لیکن ایک دوسرا کنوئاں بھی ہے جو اجنالہ (ضلع امرتسر) میں ہے"

مجھے کوئی وجہ نہیں نظر آتی کہ کیوں اس کو اس لازوال شہرت سے محروم رکھا جائے۔ جس کے حاصل کرنے کی اس کو زبردست خواہش تھی۔ یعنی اس کے نام کو بھی نانا صاحب کے مظالم کے ساتھ ساتھ

---

[1] Mont Gomery Martin, Chapter XXII

[2] Letters written during the seige, P. 15.

سفاکوں کی فہرست میں ہمیشہ کیلئے زندہ رہنا چاہیئے۔

(۱۱)

ہمارے دشمنوں کا انجام تو ناظرین نے پڑھ لیا۔ اب ہمارے دستوں کا حال بھی ملاحظہ ہو:۔

"ایک افسر جو رینالڈ (RENAUD) کے دستے کے ساتھ متعین تھا تبلاتا ہے کہ ہندوستانیوں کو اس کثرت کے ساتھ پھانسیوں پر لٹکایا گیا۔ جو بیان سے باہر ہے۔ دو دن کے اندر بیالیس[۴۲] آدمیوں کو سڑک کے کنارے پر پھانسی دی گئی۔ اور بارہ (۱۲) آدمیوں کو تو صرف اس جرم پر پھانسی کی سزا ملی کہ جب فوج مارچ کرتی ہوئی ان کے سامنے سے گذری تو ان کے چہرے دوسری طرف کیوں تھے۔ جہاں جہاں فوج نے پڑاؤ کئے وہاں پر قرب و جوار کے تمام دیہات جلے ہوئے تھے۔ یہ کہنا کہ یہ سب مظالم کانپور کے حادثہ کا جواب تھے صحیح نہیں۔ کیونکہ کانپور کا شیطانی واقعہ اُن خوفناک حوادث کے بہت بعد پیش آیا تھا۔ افسر مذکور نے رینالڈ (RENAUD) کو اس طرز عمل کے خلاف احتجاجاً مشورہ دیا اگر ہم اسی طرح دیہات کو جلانے کی کارروائی کرتے رہیں گے۔ تو نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ فوج کو راستے میں رسد اور چارہ بالکل دستیاب نہیں ہو سکے گا"[لے]

لے Russel, Diary, P. 221, 222.

سر مذکور کی یہ پیشگوئی حرف بحرف درست ثابت ہوئی۔ چنانچہ اکثر مقامات
را ستے میں ہماری فوج کو غلہ وغیرہ فراہم کرانے میں سخت تکالیف کا
منا کرنا پڑا۔ کیونکہ تمام علاقہ ویران اور تباہ ہو چکا تھا۔ اور ایک
نفس ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتا تھا۔ نیز اس لئے بھی لوگ ہمیں
دد دینے سے احتراز کرتے تھے کہ انہیں خدشہ تھا کہ امداد دینے
کے باوجود بھی انہیں پھانسی پر لٹکا دیا جائیگا۔ ایسے حالات میں یہ
یادہ حیران کُن تھا۔ کہ پھر بھی ہندوستانیوں نے اکثر امداد کی۔

"ہندوستانیوں کے خلاف طبائع اس حد تک برانگیختہ ہو گئی تھیں کہ
آج اُس پر یورپ میں مشکل سے لوگ یقین کریں گے۔

چنانچہ ملازمین کا وہ طبقہ جو شروع سے آخر تک نہایت جانفشانی
کے ساتھ وفادار رہا۔ اُن سے بھی بعض افسران نے نہایت بے
جا طور پر سختی کی۔ یہانتک کہ اکثر کو زدوکوب کیا جاتا تھا۔ گولہ باری
کرتے وقت پانی پلانے والوں کو مجبور کیا جاتا تھا۔ کہ وہ پانی مہیا
کریں۔ حالانکہ بہت سے اس کام میں گولیوں کا نشانہ بنائے
گئے۔ یعنی پانی مہیا کرنے کے لئے ان گولیوں کی زد سے گذرنا پڑتا
تھا۔ جس سے وہ بدقسمت گولیوں کا شکار بنتے تھے۔ سائیس گھسیارے
اور کہاروں کو دن کی گرمی اور رات کی سردی میں کھلے میدان کے
اندر سخت دقت کے ساتھ وقت گذارنا پڑتا تھا۔ حالانکہ اُن میں
سے اکثر ہماری خدمت کرتے ہوئے زخمی بھی ہوئے تھے۔ دہلی میں

باشندوں کے قتلِ عام کی منادی کی گئی۔ حالانکہ ان میں ایسے لوگ بھی شامل تھے جن کے متعلق ہمیں علم تھا کہ وہ ہماری فتح کے خواہش مند تھے۔ ہمارے اکثر نوجوان تو محض خون گرانے کی خواہش کو پورا کرنے کے لئے اپنی ہی فوج کے ہندوستانی اردلیوں اور پوربی گھسیاروں وغیرہ کو گولی سے اڑا دینے کی تمنّا کا علانیہ طور پر اظہار کرتے تھے" لہ

کے ای (KAYE) جس نے متذکرہ صدر واقعہ قلمبند کیا ہے مکروہ حالات پر پردہ ڈالنے کیلئے لکھتا ہے کہ :-

"فوجی کیمپ میں ہندوستانی ملازمین کے ساتھ جو خلافِ انسانیت سختیاں کی گئی ہیں۔ اگرچہ ان کا ذکر اس سے پہلے میں نے خاص طور پر کیا ہے۔ لیکن ان واقعات کے اطلاع دہندوں نے ساتھ ہی اس شبہ کا ذکر بھی کیا ہے کہ وہ بہ یقین سے نہیں کہہ سکتے، کہ انگریزوں کے سلوک میں سختی کا عنصر غدر کے بعد پیدا ہوا۔ یا اس سے پہلے بھی موجود تھا۔ یعنی غدر سے پہلے بھی ہندوستانی ملازمین کے ساتھ کوئی بہتر سلوک نہیں ہوتا تھا۔ بنا بریں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ بُرا سلوک کسی منتقمانہ رنگ سے کیا گیا تھا"

میجنڈی (Majendie) لکھنؤ کے محاصرے کے دوران میں ایک عارضی سکون کا نقشہ ذیل کے الفاظ میں کھینچتا ہے کہ :-

---

لہ The chaplains narrative of the seige of Delhi

"اس تمام سلسلے میں ایک نمایاں جوش کی کیفیت پائی جاتی تھی جس سے ہم سب کے حوصلے برقرار رہتے تھے۔ اس پر مستزاد تفریح کا وہ دلچسپ مشغلہ تھا جو ہندوستانی خدام کو چھیڑ کر خوف و خطرہ کی حالت میں دھکیلنے سے پیدا ہوتا تھا۔ یعنی جس وقت یہ غریب انسان اپنے آقاؤں کا کھانا وغیرہ لیکر آتے تھے۔ تو انہیں مجبوراً بازار کے ایسے حصّے سے بھی گذرنا پڑتا تھا۔ جو عین دشمن کی گولیوں کی زد میں واقع تھا۔ تو ایسے خطرے کی حالت میں اس قسم کی عجیب و غریب حرکات کرتے تھے جو دیکھنے سے تعلق رکھتی تھیں۔ یہاں پر شرم و ندامت سے یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ بعض دفعہ ہم خود بھی ان کے خوف و ہراس کو بڑھانے کے لئے اور لطف اُٹھانے کیلئے ان کی ٹانگوں کے درمیان پتھر پھینک دیا کرتے تھے"۔[1]

ان پتھروں کو بندوق کی گولیاں سمجھ کر یہ بیچارے اپنی جان بچانے کے لئے بے ساختہ چھلانگیں مار کر اس طرح دوڑتے تھے کہ اُن کے گاڈ دمی آقا اپنی پناہ کی جگہ سے اس نظارہ کو دیکھ کر کھل کھلا کر ہنس دیتے تھے۔ مجینڈی لکھتا ہے کہ اگر کوئی خادم فربہ اندام یا بزدل ہونے کی وجہ سے بھاگنے کے ناقابل ہوتا تھا۔ تو اُسے ڈرانے اور اس کا تمسخر اڑانے کے لئے ہم حقّے کو اُس کی ٹانگوں کے درمیان پھینک دیتے تھے جسے وہ غلطی سے توپ کا گولہ سمجھ لیتا تھا۔ لیکن دوسری

---

۱ Up among the pandies, P. 211

طرف غدر کے مصائب اور مظالم کے مقابلہ میں وینسنٹ سم
(Vincent Smith) ایسے ہی خدام اور دیہاتیوں کی تعریف
ہوئے لکھتا ہے۔ جنھوں نے ہمارے آدمیوں کو اپنی جان جوکھ
میں ڈال کر پناہ دی اور جان بچائی۔

"وفاداری - مروت اور ایثار کی سینکڑوں ایسی مثالیں ملتی ہیں جو
انسانی فطرت کا طرۂ امتیاز ہیں"[1]

اس لئے کہ تمام ہندوستانی قوم نے دغاباز ہونے کا ثبوت نہیں
بلکہ اکثر نے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال کر متعدد انگریزوں کو بچا
میں نہایت فیاضی اور فراخدلی کا ثبوت دیا۔ برطانوی قوم کا ایک
نہایت ہی قلیل طبقہ آج بھی نہایت ظالمانہ جانبداری سے ہندو
عیسائیوں کے افعال پر نکتہ چینی کرتے ہوئے نہیں شرماتا۔ جا
انہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ ہزارہا ہندوستانی عیسائی محض اس
سے باغیوں کے ہاتھوں قتل کئے گئے کہ انہوں نے ہماری امدا
کیوں کی۔ یہاں پر یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ اس بدترین عیس
حکومت کے مردوں اور عورتوں کے بچانے میں صرف ہندوس
عیسائیوں نے ہی امداد نہیں کی۔ بلکہ ان کے علاوہ دوسری قو
بھی شامل تھیں۔

(۱۲)

1. Oxford History of India, P. 723.

بہر حال جو شرمناک سلوک کہ ہم نے سول آبادی سے روا رکھا۔ وہ ہماری شہرت پر ایک سیاہ ترین داغ کی حیثیت رکھتا ہے۔ کانپور کے حادثہ سے بہت عرصہ پہلے :-

"ایک طرف تو فوجی قانون کے نفاذ کا اعلان کیا گیا۔ اور دوسری طرف مجلس وضع آئین و قوانین نے مئی اور جون میں نہائت خوفناک قوانین پاس کیئے جن پر پوری سرگرمی سے عمل کیا گیا۔ اور فوجیوں اور سول افسران نے خونی عدالتیں قائم کر کے ہندوستانیوں کو بے دریغ موت کے گھاٹ اُتارنا شروع کر دیا۔ بلکہ بعض حالات میں تو بغیر کسی نام نہاد عدالت کے حکم سے بھی پھانسیاں دی گئیں۔ جن میں مرد عورت کی کوئی تمیز روا نہ رکھی۔ باایں ہمہ خونریزی کی آگ دن بدن اور بھڑکتی گئی۔ چنانچہ آج بھی پارلیمنٹ کے محفوظ ریکارڈ میں گورنمنٹ ہند کی وہ تمام یادداشتیں محفوظ ہیں۔ جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ باغیوں کے علاوہ عام آبادی میں سے عورتوں، مردوں، بچوں اور بوڑھوں تک کو بھی پھانسی کے تختوں پر لٹکایا گیا۔ نہ صرف سولی پر ہی اکتفا کیا گیا۔ بلکہ دیہات میں اُن کو اپنے مکانوں میں بند کر کے آگ میں جلا کر خاکستر کر دیا گیا۔ اور شاذ و نادر ہی کسی ایک کو گولی سے مارنے کی تکلیف کی گئی ہو۔ انگریزوں نے نہ صرف اس قسم کی خوفناک سزاؤں کا تجزیہ اظہار ہی کیا بلکہ

خود اپنی یادداشتوں میں ان دردناک واقعات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہم نے حتی الامکان کسی ذی رُوح آبادی کو زندہ نہیں رہنے دیا۔ یہانتک کہ اُن سیاہ فام انسانوں کے زخموں پر نمک چھڑکنے کے نظاروں سے اپنی خون آشامی کی پیاس بجھا کر لطف اُٹھاتے رہے ہیں" لہ

قارئین یقیناً بیدردی اور ظلم کے مسلسل واقعات کو پڑھ کر نہایت برداشتہ خاطر ہو گئے ہوں گے۔ لہذا اب میں انگریزی انصاف کے چند نمونے پیش کرتا ہوں۔ جن کا مختلف مقامات پر اظہار کیا گیا۔ مگر اپنی طرف سے مزید حاشیہ آرائی بالکل نہیں کروں گا۔

بنارس اور الہ آباد میں کانپور کے حادثہ سے پہلے:۔

"ایک موقع پر چند نوجوان لڑکوں کو محض اس بنا پر پھانسی کی سزا دی گئی کہ انہوں نے غالباً تفننِ طبع کے طور پر باغیوں کی جھنڈیاں اُٹھاتے ہوئے بازاروں میں منادی کی تھی۔ سزائے موت دینے والی عدالت کے ایک افسر نے پُرنم آنکھوں سے کمانڈنگ افسر کے پاس جا کر درخواست کی کہ ان نابالغ مجرموں پر رحم کر کے پھانسی کی سزا کو تبدیل کر دیا جائے۔ لیکن بے سُود۔ اس تمام سلسلے میں بے شمار ایسے واقعات ملیں گے۔ جن میں اس قسم کی نمائشی عدالتوں تک سے بھی گریز کیا گیا، اور بیگناہ انسانوں کو

لہ KAYE, Book V, Chapter ii.

بیدریغ قتل کیا گیا۔ پھانسیاں دینے کے لئے رضاکارانہ ٹولیاں
بنائی گئیں۔ جنہوں نے اس مقصد کی تکمیل کے لئے دیہات میں
دورہ کیا۔ اس حالت میں کہ اُن کے ساتھ پھانسی دینے کا سامان
بھی مکمل نہیں تھا۔ اور نہ ہی کسی کو پھانسی دینے کے طریق سے
پوری واقفیت تھی۔ چنانچہ ان میں سے ایک "شریف آدمی"
اپنی شاندار کامیابی کا اس طرح فخریہ اظہار کرتا تھا کہ ہم پھانسی
دیتے وقت عام طور پر آم کے درخت اور ہاتھی کو استعمال کیا
کرتے تھے۔ یعنی ملزم کو ہاتھی پر بٹھا کر درخت کے نیچے لے
جاتے تھے اور اوپر سے رسّہ ڈال کر ہاتھی کو ہنکایا جاتا
تھا۔ یہانتک کہ ملزم اِس طرح تڑپنے اور جانکنی کی حالت
میں اکثر اوقات انگریزی کے آٹھ (8) ہندسے کی دلچسپ
شکل بن کر رہ جاتا تھا۔"[1]

پٹنہ میں مسٹر ٹیلر (TAYLER) کمشنر کا باغیوں کے خلاف شہادتیں
فراہم کرنے کا طریقہ :-

"مَیں نے گواہ سے کہا کہ مَیں تمہاری جان بخشی کر دیتا ہوں۔ بشرطیکہ
تم اس کے عوض کوئی تین ایسے نام بتاؤ جن کو تمہارے عوض میں
پھانسی دی جائے۔ چنانچہ اس نے وہی نام بتائے جن کو میں
پہلے ہی جانتا تھا۔ لیکن اس پر بھی ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا۔

---

[1] Kaye, Book V, Chapter II.

جس سے ہم اپنی آرزو کو پورا کر سکتے ہیں" [۱]

سہارنپور :۔ "یہاں پر حالات ایسے نازک تھے کہ ہمیں مناسب انتظام قائم رکھنے کیلئے متعدد پھانسیاں دینے کی ضرورت پیش آئی۔ چنانچہ ہمارے ایک ماتحت سول افسر نے اس ضرورت کو قرار واقعی طور سے پورا کیا۔ جس کی تفصیل کو اس نے ایک کتاب کی صورت میں قلمبند کیا ہے جو میری نظر سے نہیں گذری ۔" [۲]

آگرہ :۔ "یہاں کے دیہات سے متعدد کسانوں کو جنہوں نے بغاوت میں حصہ لیا تھا۔ گرفتار کیا گیا۔ اور اُن باغی سپاہیوں کے ساتھ پھانسی پر لٹکا دیا گیا جو قرب وجوار سے پکڑے گئے تھے۔ فوجی عدالت کے سامنے ان میں سے بعض نے تو عجیب وغریب حرکات کیں۔ یعنی بعض نے تو فرضی طور پر دیوانگی اختیار کر لی۔ جس کے اظہار کے لئے وہ مکھیاں پکڑ کر ہمارے سامنے بیدریغ چباتے تھے اور بیہودہ بکواس کرتے جاتے تھے۔ لیکن بعض فوجی عدالت کے افسران کے ساتھ نہایت گستاخانہ طریق پر درشت کلامی سے پیش آئے" [۳]

---

۱ Mont Gomery Martin Chaptar XX.

۲ Sir George campbell ,1, P. 238. Letter 12 th, August 1857.

۳ P. 212. A lady's Rescape from Gawaliar.

دہلی پر قبضہ کرنے کے بعد۔" مسز کوپلینڈ (Mrs. Coopland)
۲۳ ستمبر ۱۸۵۷ء کو اپنی ایک چٹھی میں لکھتی ہیں کہ دہلی کے محاصرے
سے لیکر اب تک اعلیٰ فوجی حاکم کے حکم سے چار سو سے لیکر پانچسو تک
بدقسمت انسانوں کو قتل کی سزا دی گئی۔ چنانچہ اب وہ اپنی جگہ
سے استعفیٰ دینے کا خیال کر رہا ہے۔ مزید برآں یہ بھی سننے میں
آیا ہے کہ خونریزی کے عادی سپاہیوں نے جوشِ انتقام
کو فرو کرنے کے لئے پھانسی دینے والے جلّادوں کو رشوت
دیکر آمادہ کیا ہوا تھا۔ کہ لاش کو پھانسی کے تختے پر زیادہ دیر
تک لٹکے رہنے دیا جائے۔ تاکہ لاش کے تڑپنے کی دردناک
کیفیت کو دیکھ کر جسے وہ ناچ سے تشبیہہ دیتے تھے۔ اپنی
خونخوار طبائع کے لئے دلچسپی کا سامان بنا سکیں۔ اس کے
میزبان کیپٹن گارسٹن (Captain Garstin) نے بتایا
کہ جھجر کے نواب صاحب کو جان دینے میں بہت عرصہ لگا۔ کیونکہ
وہ ابھی اس کو پھانسی پر لٹکتے ہوئے دیکھ کر آیا ہے۔"[1]

" ایک دن ایک ہندوستانی جوہری مسز گارسٹن (Mrs. Garstin)
کے پاس سونے چاندی کے کچھ ظروف بیچنے کیلئے لایا اور مسز
موصوفہ نے یہ سمجھ کر کہ دام کچھ زیادہ بتائے گئے ہیں۔ ویسے ہی
تفنّنِ طبع سے کہا کہ دیکھو تم کو مٹکاف (Mitcalf) صاحب

---

[1] A Lady's Rescape from Gawaliar. P. 269.

کے پاس بھیجدیں گے۔ چنانچہ اس فقرے کو سنتے ہی وہ حواس باختہ ہوگیا۔ اور اس طرح سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگا۔ کہ اپنے قیمتی ظروف بھی وہیں چھوڑ گیا۔ جس کے بعد اس نے کبھی اپنی صورت نہ دکھائی، اور نہ ہی ظروف کی واپسی کا مطالبہ کیا"[1]

"یعنی دوسرے دن سر تھیوفی لس میٹکاف (Sir Theophilus Metcalf) کو دیکھا جسے ہندوستانی نہایت دہشت اور خوف کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ چنانچہ جہاں کہیں اُسے ہندوستانی ملتے ہیں وہ انہیں سزائیں دیتا ہے۔ اور جہانتک ممکن ہوتا ہے۔ گرفتار شدگان کو پھانسی پر لٹکائے جاتا ہے"[2]

"تمام رجحان رحم کے اظہار کرنے کی پالیسی کے خلاف ہیں۔ چنانچہ تمام ایسے ملزمین جو پیش کئے گئے تقریباً سب کے خلاف فردجرم لگادی گئی اور موت کی سزا کا حکم دے دیا گیا۔ شہر کے ایک بلند مقام پر ایک چوگوشہ سولی نصب کی گئی ہے جہانکہ پانچ اور چھ اشخاص کو روزانہ پھانسی دی جاتی ہے جس کے قریب ہی انگریز افسران سگرٹوں کے کش پر کش اڑاتے ہوئے لاشوں کے تڑپنے کے نظاروں میں محو دکھائی دیتے ہیں"[3]

---

[1] Ibid, P. 273.

[2] Times, A Letter from Delhi, January 1

[3] Holmes, P. 386.

"دہلی میں جو دردناک سختیاں روا رکھی گئی ہیں وہ بیحد افسوسناک ہیں۔ چونکہ میں اُس وقت دہلی میں موجود نہیں تھا۔ اس لئے تفصیل سے لاعلم ہوں۔ لیکن جو کچھ میں نے سُنا ہے اُس سے تو میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ان میں سے بیشتر پھانسیاں یقیناً انصاف کے خلاف دی گئی تھیں۔" [1]

"دہلی پر قبضہ کرنے کے دن سے لیکر سوائے چند دنوں کے پانچ سے لیکر چھ تک روزانہ پھانسیوں کی تعداد تھی۔ اور اگر اسی طرح معمولی قانون سے قطع نظر کر کے سزائے موت کی پالیسی پر عمل ہوتا رہا تو اس ملک میں سول گورنمنٹ کے قیام کی توقع تقریباً ناممکن ہو جائے گی" [2]

شمال مغربی سرحدی صوبہ اور پنجاب:۔ "اِن صوبوں میں نہ صرف ہر قسم کے جرائم کے بدلے میں بلکہ ایسے مشتبہ جرائم کے عوض بھی اندھا دھند پھانسیاں دینے کی کارروائی سے جس میں مرد عورت بوڑھے اور بچے کی کوئی تمیز روا نہ رکھی گئی۔ نیز بے شمار دیہات کے جلائے جانے کی وجہ سے، آبادی کے اُس حصہ میں بھی نفرت اور دہشت پھیل گئی ہے جو اس وقت تک گورنمنٹ کے خلاف نہ تھی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ فصلیں تباہ ہو گئی ہیں اور قحط کے

---

1. Cambell, P, 248.

2. Lord Allenborough in Parliment on 16.2.58.

پھیلنے کا سخت احتمال ہے۔ مزید برآں وہ سپاہی جو چھٹیوں پر گئے ہیں یا جن کی پلٹنیں توڑ دی گئی ہیں۔ یا جنہوں نے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالکر، اپنے افسران کو باغیوں کے غصہ سے بچانے کی کامیاب کوشش کی۔ ایسے تمام افراد انگریزوں کی درشت پالیسی کو دیکھ کر اور بے دریغ سزاؤں اور ہندوستانیوں کے خلاف علانیہ نفرت کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے جان ومال کو بالکل غیر محفوظ حالت میں محسوس کرتے ہیں۔ کیونکہ بدقسمتی سے انگریز افسران کا طرز عمل نہایت ہی قابلِ اعتراض تھا۔ بلکہ اب بھی بعض مقامات سے اس قسم کی دلخراش اطلاعات سُننے میں آتی ہیں۔ جن کی بنا پر یہ افواہ نہایت ترقی پکڑ گئی ہے۔ کہ گورنمنٹ کا منشاء تمام ہندوؤں اور مسلمانوں کو بے دریغ قتل کر دینے کا ہے [1]

(۱۳)

ان حالات کو دیکھ کر یہ آسانی سے کہا جا سکتا ہے کہ حکومت محض چانسیوں کے بل بوتے پر کی جا رہی تھی۔ جس میں لبعد میں عام قتل و غارت گری بھی شامل کی گئی۔ چنانچہ ایل کارتھل (Al carthal) لکھتا ہے کہ:۔

"عام قتل وغارت بذاتہ ایک ایشیائی دماغ کے لئے جو حکومت

[1] Governor General in council 24th D... 57 on state of Offairs in July.

وقت کی طرف سے عمل میں لائی جائے، بہت حد تک قابل نفرت نہیں ہوا کرتی۔ کیونکہ وہ ایسے تجربات سے بخوبی آشنا رہ چکا ہے۔ سیاسی قتل و غارت کے مختلف طریقے ہیں جن میں سے کوئی بھی اس کے ذہن پر ناخوشگوار اثر نہیں ڈالتے۔"

غدر میں قتل و غارت گری کی وارداتیں گورنمنٹ کی طرف سے بیشتر دیکھنے میں آئیں۔ چنانچہ جھانسی۔ کانپور اور دہلی میں اگرچہ منتقمانہ حیثیت سے اس قسم کی قتل و غارت گری کے لئے کسی قدر گنجائش بھی موجود تھی۔ لیکن لکھنؤ میں تو بلا وجہ قتل و غارت کا بازار گرم کیا گیا۔ جس کی تفصیل ایک افسر کے قلم سے ذیل میں دی جاتی ہے۔

"لکھنؤ پر قبضہ کرنے کے بعد قتل و غارت کا بازار گرم کیا گیا چنانچہ ہر ایسے ہندوستانی کو قطع نظر اس کے کہ وہ سپاہی ہے۔ یا اودھ کا دیہاتی، بیدریغ تہ تیغ کیا گیا۔ یہانتک کہ نہ تو کوئی سوال ہی کیا جاتا تھا اور نہ ہی اس قسم کا کوئی تکلف روا رکھا جاتا تھا۔ بلکہ محض سیاہ رنگت ہی اس کے مجرم ہونے کے لئے کافی دلیل سمجھی جاتی تھی۔ اور ہلاکت کیلئے ایک رسہ اور درخت کی شاخ کا استعمال کیا جاتا تھا۔ یا اگر یہ اشیاء مہیا نہ ہوں تو بندوق کی ایک گولی بے گناہ انسان کے دماغ کو چیرتی ہوئی نکل جاتی تھی اور وہیں ڈھیر ہو جاتا تھا"[1]

---

[1] Majendie, P. 195, 196.

دہلی میں "ہماری فوج کے شہر میں داخل ہونے پر تمام ایسے لوگ جو شہر کی چاردیواری کے اندر چلتے پھرتے نظر آئے سنگینوں سے وہیں پر ختم کر دیئے گئے۔ ایسے بدقسمت انسانوں کی تعداد بہت کافی تھی۔ آپ اس ایک واقعہ سے بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ایک گھر میں چالیس یا پچاس ایسے اشخاص ہمارے خوف سے پناہ گزیں ہو گئے جو اگرچہ باغی نہ تھے بلکہ غریب شہری تھے اور ہمارے عفو و کرم پر تکیہ لگائے ہوئے تھے۔ جن کے متعلق میں خوشی سے یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ وہ سخت مایوس ہوئے کیونکہ ہم نے اُسی جگہ اُن کو اپنی سنگینوں سے ڈھیر کر دیا"[1]

"بیگناہ شہریوں کو درآنحالیکہ وہ ہاتھ جوڑ جوڑ کر رحم کی درخواست کر رہے تھے گولی کا نشانہ بنایا گیا۔ بلکہ عمر رسیدہ انسانوں کو حالانکہ اُن کے جسم رعشہ سے کانپ رہے تھے، کاٹ کر رکھ دیا گیا۔ لیکن اگر انصاف سے دیکھا جائے تو فوجیوں کو اس قسم کے قتل کرنے کی زبردست ترغیب دی گئی تھی۔ کیونکہ ان کے بہت سے ساتھیوں کو جبکہ وہ شہر میں اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے بعض مذہبی دیوانوں اور بدمعاشوں نے موقع پا کر شہر کے غیر آباد محلوں میں اُن پر حملے کئے اور بہت بُری طرح سے مار ڈالا۔"[2] [2] Holmes, P. 370

---

[1] Letters in the Bombay Telegraph Montgomery Martin

حُبّ الوطنی کا جذبہ متین دماغوں پر بہت بُرا اثر ڈالا کرتا ہے۔ جس سے یہ لوگ اکثر دماغی توازن کھو بیٹھتے ہیں۔ چنانچہ آخری مصنف ہمیں ابھی یہ بتاتا ہے کہ دہلی میں داخل ہوتے ہی ہمارے سپاہیوں نے پہلا کام یہ کیا کہ شراب کی دکانوں کو بے دریغ لوٹنا شروع کر دیا۔ وہ یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ ہندوستانیوں پر کسی قسم کے رحم کا اظہار نہیں کیا گیا۔ پھر بھی جب ہمارے سپاہی شراب اور خونریزی کے نشے میں غصّے سے اندھے ہو کر ہندوستانیوں پر اس نیت سے حملہ آور ہوئے کہ اِن کو بے دریغ قتل کر دیا جائے تو ان میں سے بعض ہندوستانیوں کے ہاتھوں قتل کیے گئے۔ چنانچہ ہمارا انصاف پسند مصنف اس واقعہ پر اظہار رائے کرتے ہوئے اس کو "بیدردانہ قتل" بتاتا ہے اور قاتلوں کو مذہبی دیوانہ لکھتا ہے۔" ہم حیران ہیں کہ بقولِ مصنّف ان مذہبی دیوانوں کو اس وقت کونسا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیئے تھا۔ کیا اس کا یہ مقصد ہے کہ تمام ہندوستانی نہایت نرمی اور سہولیت کے ساتھ اُن شرابی لٹیروں کو اُن کی قیامگاہوں پر پہنچا آتے اور وہاں سے فارغ ہو کر اپنے آپ کو شہر کے فوجی جرنیل کے سپرد کر دیتے جو ایکدم اُن کے خاتمہ کرنے کا حکم دے دیتا۔ یہ ایک ادنیٰ امثال ہے کہ کس طرح غدر کے متعلق مجرّدہ "بہترین کتاب" میں" ایماندارانہ طریق پر مصنف نے واقعات پر بحث کی ہے۔ چنانچہ ٹائمز کا نامہ نگار لکھتا ہے کہ:۔

"میں نے دہلی کے گمنام بازاروں میں سیر کرنا مطلقاً چھوڑ دیا ہے۔ کیونکہ کل ایک ایسا دردناک واقعہ دیکھنے میں آیا۔ جس سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ یعنی جب ایک افسر بیس سپاہی لے کر شہر کی گشت کو جانے لگا تو میں بھی اُن کے ہمراہ ہولیا اور راستے میں ہم نے چودہ (۱۴) عورتوں کی نعشوں کو شالوں میں لپٹے ہوئے بازار میں پڑا پایا۔ جن کے سر دھڑوں سے اُن کے خاوندوں نے خود جدا کئے تھے۔ چنانچہ ایک عینی شاہد سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ دردناک حادثہ اس لئے ظہور پذیر ہوا۔ کہ ان مستورات کے خاوندوں کو شبہ تھا کہ اگر انگریز سپاہیوں کے قابو میں آگئیں تو وہ ان کی عصمت دری کردیں گے۔ اسی لئے بحالاتِ موجودہ اپنے ناموس کے تحفظ کا یہی طریقہ مناسب خیال کیا گیا۔ جس کے بعد انہوں نے خود بھی خودکشی کرلی۔ چنانچہ ہم نے اُن کے خاوندوں کی لاشوں کو بھی بعد میں دیکھا۔"[1]

"نادر شاہ کی تاریخی لوٹ اور قتلِ عام کے بعد جبکہ اس نے چاندنی چوک کی مسجد میں بیٹھ کر غارت گری کا حکم دیا تھا۔ ایسا دردناک نظارہ آج سے پہلے شاہجہان کے دارالخلافہ نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔"[2]

دہلی کے فتح کرنے میں ہمارے سپاہیوں نے بہادری اور جوانمردی کے

---

[1] Times, Letters Dated 19.11.57. Montgomery Martin.

[2] Times, 16.11.57.

جو جو کارہائے نمایاں سرانجام دیئے۔ اُن کو آکسفورڈ تاریخ ہند کے مصنّف نے نہائت خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ لیکن اس کے بعد کی قتل و غارت گری کے متعلق نہائت احتیاط سے اشارہ تک نہیں کیا۔ البتہ صرف اتنا ہی لکھا جتنا کہ ایک مہذب سپاہ سے ایسے اوقات ہیں عام طور پر کسی شہر کے فتح کرنے کے بعد توقع کی جاسکتی ہے۔ اس کے برخلاف نادر شاہ کی تاریخی لوٹ پر جن گرانقدر خیالات کا اظہار فاضل مصنّف نے کیا ہے۔ میرے خیال میں قارئین کیلئے یقیناً دلچسپی کا موجب ہوگا۔ چنانچہ وُہ لکھتا ہے کہ:۔

"نادر شاہ نے نہایت خوفناک انتقام لیا۔ روشن الدولہ کی سنہری مسجد میں بیٹھ کر جو شہر کے ایک ممتاز بازار میں واقع ہے۔ اس نے پورے نو گھنٹے تک ہزاروں بگناہ انسانوں کے دردناک قتل و غارت کا نظارہ دیکھا۔ آخر کار محمد شاہ کے عاجزانہ گڑگڑانے سے متاثر ہو کر اس نے اس قتلِ عام کو روکنے کا حکم دیا۔ جو اسی وقت ختم کر دیا گیا۔"

یہ واقعہ تو ایکسو سال پہلے کا ہے یعنی نادر شاہ کا حملہ ۱۷۳۹ء میں ہوا۔ لیکن بالکل ویسے ہی دردناک بیانات غدر کے سلسلے میں ہم پہلے پڑھ آئے ہیں۔ بعینہ یہی دردناک نظارہ ہماری آنکھوں نے اس وقت دیکھا جب جرمنی نے بلجیم پر حملہ کیا اور یہی تباہی اور بربادی غدر میں دہلی کے باشندوں کے حصے میں آئی۔ جس کی تفصیل درج

ذیل ہے کہ :-

"باغیوں کے جرائم کے مقابلے میں ہزار گناہ زیادہ سنگین پاداش باشندگانِ دہلی کو برداشت کرنی پڑی۔ ہزارہا مرد۔ عورت اور بچوں کو بیگناہ خانماں برباد ہو کر جنگلوں اور ویرانوں کی خاک چھاننی پڑی اور جتنا مال و اسباب وہ پیچھے چھوڑ گئے۔ ان سے ہمیشہ کے لئے ان کو ہاتھ دھونے پڑے کیونکہ سپاہیوں نے گھروں کے کونے کھود کر تمام قیمتی اشیاء کو قبضہ میں کر لیا۔ اور باقی سامان کو توڑ پھوڑ کر خراب کر دیا۔ جس کو کہ وہ اٹھا کر نہیں لے جا سکتے تھے" [1]

"عورتوں کی ایک بہت بڑی تعداد نے اپنے آپکو ہمارے رحم پر چھوڑ دیا۔ جن سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا۔ کئی دفعہ ایسی بیکس اور شریف عورتوں کے غول کے غول ماتمی قافلوں کی شکل میں دیکھنے میں آئے۔ جن میں سے اکثر بیچاری بچوں کو اٹھا کر مشکل سے چل سکتی تھیں اور بعض کے ساتھ عمر رسیدہ مرد نظر آتے تھے جو چلتے ہوئے ٹھوکریں کھا کھا کر گر پڑتے تھے" [2]

"تمام آبادی کو شہر چھوڑنے پر مجبور کیا گیا۔ جن کے لئے اپنے مال و اسباب کو دوبارہ دیکھنے کا کوئی موقع نہیں تھا۔ اِدھر اُدھر

---

[1] Holems, P. 386.

[2] Greathed, P. 285. Letter dated 18.9.57.

بعض بوڑھے مرد بھی دیکھنے میں آتے تھے، جن کے ساتھ ہمدردانہ سلوک کیا گیا اور شہر سے نکل جانے کیلئے مناسب سہولتیں بہم پہنچائی گئیں۔ ایسی کوئی مثال ہمارے سُننے میں نہیں آئی کہ کہیں کسی عورت کو ارادۃً "قتل کیا گیا ہو" لہ

باوجود اس کے کہ میرے بعض پادری دوستوں نے مجھے یقین دلانے کی کوشش کی ہے کہ دو پشتیں گذر جانے پر ہندوستان اور بالخصوص دہلی والوں کے دماغ سے غدر کے خوفناک مظالم کی یاد محو ہو چکی ہے لیکن اس وقت اس کی صحت یا عدم صحت پر بحث کرنی نہیں چاہتا کیونکہ ہماری سلطنت کا نیا دارالخلافہ اُس پُرانی غیر فراموش شدہ تلخی اور مظلومیت کی بنیادوں پر آباد کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ بعض ایسے مقامات جو بے انتہا مصائب و تکالیف برداشت کرنے کی وجہ سے گویا ایک خاص خصوصیت حاصل کر لیتے ہیں لیکن پھر بھی ان مظلوموں کے بھوت اکثر ان مقامات کو اپنا مسکن بنا لیتے ہیں۔ بعینہٖ باشندگانِ دہلی کے دماغ میں آج بھی نا معلوم طور سے دردناک حوادث کی یاد موجود ہے۔ جو ہر انگریز مرد و عورت کے دماغ پر ایک نامعلوم اثر چھوڑ دیا کرتی ہے جو اُن سے ملنے اور سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اندر ہی اندر ایک قسم کی بے چینی سی محسوس کرتے ہیں جس سے خیالات میں ایک قسم کا ہیجان سا پیدا

لہ Greathed, P. 280. Dated 16.9.57.

ہو جاتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک ہلکا سا پردہ یکایک نگاہوں کے سامنے سے ہٹ گیا ہے۔ پہلے میں کبھی اس حالت کو سمجھ نہیں سکتا تھا لیکن اب میں محسوس کرتا ہوں کہ اُس وقت ان کو مجھ سے زیادہ علم تھا۔

(۱۴)

لیکن کانپور کے حادثہ کے متعلق کیا کہنا چاہیئے جو بے فائدہ شجاعت اور ناقابلِ بیان مصائب کی ایک دردناک یاد ہے۔ اس واقعہ کے متعلق مختلف اقتباسات پیش کر کے ناظرین کی اپنی قوت فیصلہ پر چھوڑتا ہوں :-

"مختلف شہادتوں سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ باغی سپاہیوں کی پہرہ دار جماعت نے قیدیوں کو قتل کر دینے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ یہ سنگین جرم نانا صاحب کے پانچ بدمعاش مصاحبوں کے ایما سے عمل میں لایا گیا۔ بنا بریں تمام قوم کو اس سفاکانہ قتل کا ذمہ دار قرار دینا نہ صرف حقیقت کے خلاف ہے۔ بلکہ نہایت تنگدلانہ تعصب ہے۔" [۱]

"ایک انگریز کا خون غصے اور انتقام سے کھولنے لگتا ہے جب وہ کسی ہندوستانی کے ہاتھوں کسی انگریز عورت کے قتل کے واقعہ کو سنتا ہے۔ لیکن ہندوستانی تاریخ یا افسانوں کو سن کر عام

۱؎ Sir George Forest, The Indian Mutniy XI

ہندوستانیوں کے جذبات کی کیا کیفیت ہوگی۔ جب وہ
اُن بیشمار معصوم اور گمنام عورتوں، بچوں اور مردوں کے
بیدریغ قتل کے حالات پڑھتے یا سُنتے ہوں گے جو انگریز
کے بے پناہ انتقام کا نہایت سفاکی سے شکار بنائے گئے
تھے۔ یقیناً جس طرح ہم اپنے ہمقوم افراد کے مقتول ہونے
سے چراغ پا ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح ہندوستانیوں کے دماغ
بھی ایسے واقعات سُننے کے بعد ضرور متاثر ہونگے" [1]

"اگرچہ کانپور کے خونی واقعہ میں تاریخی سنگدلی کا خوفناک طریقے سے
مظاہرہ کیا گیا تھا۔ جو نرم سے نرم الفاظ میں بھی پیش نہیں کیا جا
سکتا۔ لیکن قتل و غارت کے اس ڈرامے کو سمجھنے کے لئے ہمیں
دو باتوں کا خیال ضرور کر لینا چاہیئے اول یہ کہ جنرل ہیولاک
(HOUELOCK) نے باغیوں کو نہایت بیدردی سے پیٹا تھا۔
جس سے فارغ ہو کر وہ شہر میں داخل ہوا تھا۔ اس واقعہ کی خبر سے
ایک عام غم وغصہ اور مایوسی کی حالت پیدا ہو گئی۔ دوسرے ہمارے آدمیوں
نے کانپور پر حملہ کرتے ہوئے راستہ میں اس قدر شدید مظالم
کئے۔ جن سے باغیوں میں بے انتہا اشتعال پیدا ہوا۔
اور نتیجہ میں یہ خونی واقعہ ظہور پذیر ہوا۔ چنانچہ اس واقعہ
کے کچھ عرصہ بعد جب اس حادثہ کے متعلق پوری تحقیقات کی گئی۔

---

[1] Kaye - Book V Chapter (ii)

تو کوئی بھی ایسا ثبوت پیش نہیں کیا گیا۔ جس سے یہ ثابت ہوتا کہ یہ خوفناک قتل کسی پہلے سے طے شدہ سازش کا نتیجہ تھا۔ دوسری طرف اگر ہم اُن بے شمار مظالم اور زیادتیوں کو جو ہمارے سپاہیوں کے ہاتھوں ہندوستانیوں کے خلاف عمل میں آئیں نظر انداز بھی کر دیں جن کو مسٹر کے ای Kaye نے تفصیل سے بیان کیا ہے تو پھر بھی ہر دو فریق کے حالات پر مکمل غور کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اس معاملے میں صرف ہندوستانی ہی قتل و خونریزی کے مجرم نہیں تھے۔ بنارس میں جو مظالم توڑے گئے۔ اگرچہ مجھے اُن کا مفصل علم نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ جن واقعات کا مسٹر کے ای Kaye نے وضاحت کے ساتھ ذکر کیا ہے وہ بالکل صحیح اور درست تھے۔ بالخصوص جنرل نیل[ؔ۲] NEILL کے حملہ کے وقت جس بیدردی سے قتل عام کیا گیا تھا۔ اس کو درست تسلیم کرنے میں کوئی عذر نہیں ہو سکتا۔ علاوہ ازیں میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ الٰہ آباد میں

ؔ۲ نوٹ:۔ مصنف کا اشارہ جنرل نیل NEILL کی سپاہ کے اُن ہولناک مظالم سے ہے جو محاصرہ کانپور کی غرض سے جاتے وقت رستہ میں دیہات کو ان کی تمام آبادی کے سمیت زندہ جلانے کی صورت میں سرزد ہوئے۔ اگرچہ ان بزدلانہ مظالم کے عینی شاہدوں کے تفصیلی بیانات میرے پاس موجود ہیں لیکن میں ناظرین کو ان رنجیدہ واقعات کے مطالعہ سے مزید تکلیف میں ڈالنا مناسب نہیں سمجھتا۔

تو بے انتہا انسانوں کو پھانسی کے تختے پر لٹکا یا گیا۔ چنانچہ جب جنرل نیل ان مظالم سے فارغ ہو چکا تو اس نے اپنے ایک میجر کو کانپور روانہ کیا تو اس نے بھی راستے میں نہایت بیباکانہ طریق سے لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔ حالانکہ اُن کا بظاہر کوئی قصور بھی نہیں تھا۔ قتل و غارت گری کی آخری کمی جنرل نیل خود پوری کرتا ہے۔ جب اس کے حکم سے بے گناہ انسانوں کو ایسی شدید تکالیف دیکر جان سے ہلاک کیا گیا کہ ان کے مقابلے میں ہم ہندوستانی سنگدلی اور بربریت کا ایک بھی واقعہ پیش نہیں کر سکتے"۔ [1]

سر جارج کیمبل (Sir George Campbell) نے ان افواہوں کی بھی تحقیقات کی جو غدر کے زمانہ میں نہایت کثرت سے پھیلی ہوئی تھیں کہ باغیوں نے انگریز عورتوں سے بدسلوکی کر کے ان کی عصمت دری کی۔ چنانچہ اسی بناء پر یہ کہا جاتا ہے کہ انگریز افسروں اور سپاہیوں نے اشتعال میں آ کر ایسا دردناک انتقام لیا۔ وہ ان تمام افواہوں اور کہانیوں کی صحت سے بالکل انکار کرتا ہے۔ جس کی تصدیق تقریباً تمام مستند مورخین نے بھی کی ہے [2]

---

[1] Campbell, I, P. 280.

[2] نوٹ :- کانپور میں مس ویلر Miss Wheeler کا ہی ایسا مشکوک واقعہ ہے جو غالباً کیمبل کی نگاہ سے اوجھل ہو گیا تھا۔ لیکن اس میں بھی شہادتیں اس بات کے حق میں ہیں کہ اس کو قتل نہیں کیا گیا تھا۔

ایک معزز ہندوستانی نے جس نے کافی عرصہ تک حکومت کی ہے غدر کے حالات کو قلمبند کرتے ہوئے جس تدبر اور فیاضی کا ثبوت دیا ہے اس کا عشر عشیر بھی ان فاتحین میں نظر نہیں آتا۔ جنہوں نے غدر کے واقعات کو غلط رنگ میں دنیا کے سامنے پیش کیا ہے:-

"لکھنؤ میں انگریزوں کی چھوٹی سی جماعت نے باغیوں کے بے شمار لشکر کا جس پامردی اور استقلال سے مقابلہ کیا اور خصوصاً جس عجیب طریق پر ہنری لارنس جیسے سچے اور دلاور انگریز کی اچانک موت اپنے فرض کی ادائیگی کرتے ہوئے واقعہ ہوئی۔ نیز جس بیخوفی اور دلیری سے مٹھی بھر انگریز بہادروں نے دہلی کے اندر محصور رہ کر باغیوں کے مقابلہ میں دادِ شجاعت دی۔ یہانتک کہ سرجان لارنس Sir John Lawrance جیسے بیدار مغز سیاستدان نے پنجاب کو مجبور کر دیا کہ وہ صاف طور سے میدان میں نکل کر صف آرا ہو۔ چنانچہ پنجاب نے ایسے نازک دور میں حکومت برطانیہ کی تاریخی امداد کر کے ان بہادروں کو آنیوالی مصیبت سے بروقت نجات دلائی۔ نیز جس سرعت اور کامیابی کے ساتھ وسط ہندوستان سے شمال کی طرف فوجوں کی نقل و حرکت عمل میں لائی گئی۔ اور بندھیلکھنڈ اور اودھ میں بغاوت کو فرو کرنے کے لئے جس قدر مصائب اور تکالیف سے دوچار ہونا پڑا۔ یہ تمام ایسے زرّیں واقعات ہیں جو اپنی نظیر آپ ہیں۔

چنانچہ انگریزی تاریخ کے صفحات آج بھی شجاعت و دلیری کے
ان تمام واقعات سے بریز ہیں جن کی وجہ سے انگریزی علم
ادب میں ایک معتد بہ اضافہ ہوا ہے۔ یہاں تک کہ لکھنؤ
کی شجاعت و دلیری کے واقعہ کو ملکہ وکٹوریہ آنجہانی کے
عہد کے ملک الشعراء نے اپنی دلفریب نظم میں ہمیشہ کے
لئے زندہ کر دیا ہے۔ اور عہد حاضرہ کے مشہور اہل قلم افسانہ
نگاروں نے دہلی کے قبضہ اور جان نکلسن Jhon -
Nicholson - کی بہادری کے کارناموں کو نہایت خوبی
سے اپنی تصانیف کی زینت بنایا ہے۔ لیکن دوسری طرف
غدر کے دوران کے خونی واقعات کو اس کتاب میں قلمبند
کرنا یا بحث میں لانا سخت مشکل ہے۔ کیونکہ انگریز اور
ہندوستانی دونوں کی یہ خواہش ہے کہ فریقین کے مظالم
کی یاد کو محو کرنے کے لئے اگر ممکن ہو سکے تو تواریخ کے
صفحات سے ہمیشہ کے لئے حرفِ غلط کی طرح مٹا دیئے
جائیں۔ بالخصوص وہ واقعات تو سرے سے القط
کئے جائیں جو درسی کتب میں سکول کے طلبہ کو پڑھنے
کے وقت یاد کرنے پڑتے ہیں۔ کلائیو (CLIVE)
اور ویلنگٹن (VELLINGTON) کے وقت سے
ہندوستان میں سینکڑوں جنگ ہوئے لیکن ایسی کوئی

لڑائی نہیں ملے گی جس میں فریقین نے اس کثرت سے
ایک دوسرے کو وحشیانہ ظلم اور سفاکی کا شکار بنایا ہو۔
جس طرح کہ ۱۸۵۷ء میں اظہار کیا گیا۔ باغی اگرچہ اپنے
مذہب اور تمدن کے تحفظ کے لئے اُٹھے تھے۔ لیکن
بے پناہ عورتوں اور بچوں وغیرہ کے قتل عام نے ان
کے اس اعلیٰ مقصد کو دنیا کے سامنے ذلیل و رسوا
کر دیا۔ دوسری طرف انگریز فوجوں نے راستے میں
سینکڑوں میلوں تک سڑک کے دونوں طرف دیہاتوں
کو بے دریغ قتل و غارت سے برباد کر کے ملک کو صحرا
کی طرح ویران اور سنسان بنا دیا۔ دہلی سے باغیوں
کے فرار ہو جانے کے بعد انگریز فاتحین نے باشندوں
کا قتل عام کیا اور بے ضابطہ انگریزی عدالتوں کے حکم
سے ہزاروں شہری پھانسی کے تختے پر لٹکائے گئے۔
حالانکہ ان کا بغاوت سے دُور کا بھی تعلق نہیں تھا"[۱]
History of the Indian ہندوستانی غدر کی تاریخ
(Sir George — مصنف سر جارج فاریست — Mutiny
Malleson اور میلسن KAYE اگرچہ کے ای — Forest)

---

[۱] Romesh Chundir Dutt, India in The Victorian age, P. 224.

کی تواریخ کے مقابلہ میں غدر کے حالات پر ایک مستند اور معتبر تاریخ تسلیم کی جاتی ہے۔ لیکن اس میں بھی ہمارے نوجیوں کی زیادتیوں پر نہایت خوبصورتی سے پردہ ڈالا گیا ہے۔ یعنی اشارۃً یا کنایتاً بھی ان کا ذکر نہیں کیا گیا۔ بلکہ خاتمہ پر تو آخری تین پھانسیوں کی کیفیت کو نہایت چرب زبانی سے بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ:۔

"انصاف کے منشاء کے مطابق کارروائی کی گئی اور ایسے تمام افراد کی جان بخشی کی گئی۔ جن کے خلاف قتلِ عمد کا ثبوت ناکافی تھا۔ چنانچہ ملک کو خون گرانے والوں سے مکمل طور پر پاک دصاف کر دیا گیا۔" [1]

تمام دنیا کی تواریخ کو ایک جگہ اکٹھا کر کے اگر متذکرہ صدر تصنیف کی "راستبازی" کا مقابلہ کیا جائے۔ تو غالباً ایک بھی ایسی مثال آپ کو نہیں ملے گی۔ جس میں اس طرح علی الاعلان بے حیائی سے حقیقت پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی گئی ہو۔

---

[1] Volume III, P. 623.

نوٹ:۔ پھر بھی مصنف اس امر کا اقرار کرتا ہے کہ لکھنؤ کو فتح کرتے وقت دل کھول کر لوٹا گیا۔ اور ایک دفعہ تو مردہ سپاہیوں کی نعشوں کو بھی درختوں پر پھانسی دینے کے لئے لٹکایا گیا۔

باب دوم

غدر کے اثرات

(۱)

پچھلے باب کے بیان کردہ واقعات کو پڑھ کر بعض دوستوں کے دل میں فطرۃً یہ خیال پیدا ہوگا۔ کہ بہتر ہوتا اگر واقعات کے اس غلیظ کیچڑ کو زمانہ کی تہ کے نیچے ہی بیٹھے رہنے دیا جاتا۔ اور اس طریقہ سے اسے ہلایا نہ جاتا۔ لیکن ہمارے نزدیک یہی طریقہ مناسب تھا۔ کیونکہ بیشمار انگریزی تواریخ کے مطالعہ سے یہی پتہ چلتا ہے کہ تمام انگریز مورخین نے ہندوستانی باغیوں کے سیاہ اعمال اور مظالم کو عالم آشکارا کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ مگر اس کے مقابلے میں ہندوستانیوں کے مصائب اور ناگفتہ بہ حالت سے ہماری قوم تاحال ناآشنا رکھی گئی لیکن

اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے۔ کہ میں نے اہتمام سے غدر کے متعلق کتابوں سے صرف ایسے واقعات اپنی کتاب کے لئے منتخب کئے ہیں۔ جو ہمارے خلاف جاتے تھے۔ مجھے تو اس میں بھی شبہ ہے کہ جن واقعات کو میں نے اپنی کتاب میں ترتیب دیا ہے اُن کو کسی معنے میں بھی غیر معمولی واقعات کہا جا سکے۔ سوائے ان دو واقعات کے جن میں سے ایک میں تو سکھوں کے مظالم کا ذکر ہے۔ اور دوسرے میں مسٹر کوپر Cooper کے شدید مظالم بیان کئے گئے ہیں۔ یہاں پر میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ اگرچہ میں نے مسٹر کوپر (Cooper) کی کتاب سے بعض سنگین واقعات کو نقل کیا ہے۔ لیکن میں نے اُن سے بھی زیادہ شدید اور رنجدہ واقعات کو پھر بھی چھوڑ دیا ہے۔ غدر کے متعلق تقریباً تمام دستاویزیں زبانِ حال سے ہماری زیادتیوں کا اعلان کرتی ہیں ۱۹۲۳ئہ میں غدر کے حالات پر دو کتابیں شائع ہوئیں۔ جن میں سے ایک کا نام لارڈ رابرٹس کے خطوط Letters of Lord Roberts۔ اور دوسری کا نام Miss Sommerville's Wheel Track۔ ہے۔ ان ہر دو کتب میں ہماری زیادتیاں بالکل عریاں حیثیت سے ظاہر ہوئی ہیں۔ لیکن دوسری کتاب میں تو مس موصوفہ کے چچا جان کے وہ خطوط بھی شامل کئے گئے ہیں جو بے انتہا خونریزی کے مظہر ہیں۔ ناظرین

کی آگاہی کے لئے میں یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ مسٹر موصوف
و دیگر ہم قوم ساتھیوں کی طرح غدر کے صحیح حالات سے محض نا
تھی۔ اگرچہ آپ کی اس محنت شاقہ کا میں اعتراف کرتا ہوں
ان کی کتاب کے مطالعہ سے میرے جیسے بے انتہا انسانوں کو
کچھ واقفیت حاصل ہو گی۔ چونکہ اس ملک میں ہندوستانیوں
متعلق نہ تو کسی قسم کے رحم کا جذبہ موجود تھا اور نہ ہی ان کو
برطانیہ میں اپنے جیسا شہری تصور کیا جاتا تھا۔ اس لئے یہ دونو
کتابیں طبع ہو گئیں۔ ورنہ دوسری صورت میں ان کے شائع ہو
کا کوئی امکان نہ تھا۔ اور ویسے بھی یہ کوئی اعلیٰ درجہ کا علمی ک
نہیں۔ بلکہ محض بعض واقعات کو سلسلہ وار ترتیب دیا گیا ہے ا
بس۔ بالخصوص لارڈ رابرٹسن کی کتاب میں تو قطعاً کوئی ادبی خو
نظر نہیں آتی۔

دوسری طرف جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں تو ا
جنگ کو اور زیادہ ناموافق رنگ میں پیش کر سکتا تھا۔ اگر میر
بھی خواہش ہوتی۔ حالانکہ میں نے تو جنرل نیل NEILL کے ا
کارناموں کو بالکل چھوڑ دیا ہے جو کانپور کے خونی حادثہ سے بد
زیادہ سنگین تھے۔ نیز ہوڈسن Hodson کی مشہور زمانہ
سنگدلی کی کارروائی کو بھی میں نے نہیں چھیڑا۔ اگرچہ میرے پاس
عینی شاہدوں کی دستاویزیں موجود تھیں۔ جن میں یہ بیان کیا گیا

تھا۔ کہ بے شمار دیہاتوں کو ایسے وقت میں جلا کر خاکستر بنا دیا گیا۔ جبکہ عورتیں، بچے اور بوڑھے گھروں کے اندر موجود تھے۔ لیکن میں نے نہایت ہمدردی سے ان خوفناک واقعات کو اپنی کتاب سے علیحدہ رکھا۔

نوٹ :- میں آجتک یہ نہیں سمجھا کہ ہڈسن Hodson کے واقعہ کو اتنی بدنامی کیوں نصیب ہوئی۔ کیا اس کی یہ وجہ تھی کہ مقتول شاہزادے تھے یا اس لئے کہ وہ خود اپنی فوج میں ہر دلعزیز افسر نہ تھا۔ بہر حال اس افسر کے اس مذموم فعل کی حمایت میں تو پھر بھی کسی قدر کہا جا سکتا ہے لیکن اس سے بدرجہا زیادہ سنگین مظالم کے واقعات موجود ہیں۔ جو ابھی تک پردہ اخفا میں ہیں اور دنیا ان سے قطعاً لاعلم ہے مگر ہم انکو حق بجانب قرار دینے کے لئے اپنے پاس ایک لفظ بھی نہیں پاتے۔ یہاں پر یہ بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں نے جتنے واقعات قلمبند کئے ہیں۔ ان میں سے ایک بھی تو کسی ہندوستانی قلم یا زبان سے نکلا ہوا نہیں ہے۔ مزید براں میں نے شاذونادر ہی کوئی ایک فقرہ "وحشت و بربریت کی آماجگاہ" یعنی اینگلو انڈین اخبارات یا اس سے کم درجے پر اپنے ملک کے اخبارات سے نقل کیا ہوگا۔ اس لئے جیسے کچھ اس وقت انہوں نے کہا یا لکھا۔ وہ ہمارے اسلاف کی طرح اب ناپید ہو چکا ہے۔ اور موجودہ زمانہ کے لئے مناسب

بھی یہی ہے کہ وُہ ان تحریرات کو بھول جائے۔ لیکن بدقسمتی سے یہ تلخ اور رنجیدہ واقعات خاموشی سے برداشت نہیں کئے جاسکتے۔ اس لئے کہ ایک پوری قوم کے دماغ اس وقت تک بھی ان کی یاد سے آتش زیر پا ہیں۔

(۲)

جیسا کہ اس سے پہلے بیان کیا گیا ہے کہ غدر کا اثر جنوبی ہند میں بہت کم ہوا اور نہ ہی آجتک بنگال اس حد تک متاثر ہوا۔ لیکن باوجود اس امر کے کہ بنگالی ہمارے مفروضہ ملازمین اور حلیف کی حیثیت میں شمال مغربی صوبوں میں باغیوں کے ہاتھوں قتل کئے گئے تھے۔ پھر بھی ہر سال غدر کی تلخ یاد میں کچھ اضافہ بھی ہو رہا ہے۔ چنانچہ بہار سے لیکر سرحد کے آخری کنارے تک انگریزوں اور ہندوستانیوں کے دماغوں میں غدر کی یاد ہنوز زندہ ہے۔ جس کی وجہ سے ہر دو اقوام کے خیالات اور تعلقات پر گہرا مخالف اثر پڑتا ہے۔ میرے ایک دوست نے کافی عرصہ جنوبی ہند میں مقیم رہنے کے باوجود جب غدر کے علاقوں کا دورہ کیا تو مجھے بتایا کہ کس طرح دھڑکتے ہوئے دل سے اس نے ان تمام مظالم کو سُنا۔ جب اُس بدترین دَور کی تمام صعوبتیں اور کلفتیں اس کے سامنے بیان کی گئیں۔ جن کو سُن کر اُسے بیحد صدمہ ہوا۔ چنانچہ اس زمانہ کی تلخ یاد محو نہیں ہوئی۔ بلکہ پہلے سے زیادہ

سختی اور تیزی کے ساتھ ہندوستانیوں کو اس وقت بے چین کر رہی ہے۔ دوسری طرف ہندوستان میں مقیم یورپین قوم غدر کے بعد سے اس درجہ خائف ہو گئی ہے کہ نہایت معمولی سے اشتعال انگیز واقعہ سے بھی بھڑک اٹھتی ہے۔ چنانچہ اس کے دُور بین اور محتاط افراد فی الفور مارشل لاء کے نفاذ کی ضرورت پر علانیہ زور دینا شروع کر دیتے ہیں۔ غدر کا نام آتے ہی یورپین قوم کے تصور میں بیشمار وحشی انسانوں کے بھوت بے پناہ عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے کے لئے ہاتھ بڑھا بڑھا کر سامنے آجاتے ہیں۔ جس سے وہ اس حد تک متاثر ہوتے ہیں کہ عقل و خرد کھو کر ایسی عجیب و ناشائستہ حرکات کرنے لگ جاتے ہیں۔ جس طرح ایک دیوانہ مریض بے قابو ہو جاتا ہے جیسے دماغ اور ہوش دونوں نے جواب دے دیا ہو۔ چنانچہ ایسی حالت میں خواہ مخواہ اس سے ہمدردی اور رحم کرنے کو دل چاہتا ہے مگر با ایں ہمہ یورپین قوم نے اس معاملہ میں اس سے بڑھ کر بُری حرکات کیں۔ ہمیں بارہا یہ بتایا گیا ہے کہ بائیسکوپ کے پردے پر اگر متشددانہ جرائم کے افسانوں کی تصاویر دکھائی جائیں تو دیکھنے والوں کے دماغوں پر ایک خاموش اور کمزور سا اثر ایسا ہوتا ہے کہ جس سے دماغ کے اخلاقی توے کمزور ہو جاتے ہیں اور خود بخود دیکھنے والے کا دل بھی ویسے ہی خطرناک جرائم کرنے کی طرف رغبت کرتا ہے چنانچہ

اس میں کوئی شک نہیں کہ غدر کا ڈرامہ جس پھرتی اور بلند آہنگی سے کھیلا گیا ہے تو یہ اسی کا اثر تھا کہ انگریزوں سے ایسی مکروہ اور نازیبا حرکات سرزد ہوئیں جن کی ایک عام صحیح الدماغ انگریز سے ہرگز توقع نہیں کی جاسکتی۔ بنا بریں اس کو ثابت کرنے کے لئے میں ذیل میں تین مثالیں پیش کرتا ہوں جن سے یہ بخوبی واضح ہوجائیگا۔ کہ ایک صحیح الدماغ انسان سے کبھی ایسی حرکات کی توقع نہیں ہوسکتی۔

(۳)

۱۴ر جنوری ۱۸۷۲ء کو ایک سو کے قریب سکھ مذہبی دیوانوں نے پنجاب کے ایک شہر مالیر کوٹلہ پر حملہ کیا۔ جس کے بعد کی تفصیل ایک انگریز مؤرّخ کے قلم سے ذیل میں درج کی جاتی ہے:۔

"اس مقام پر نہایت ہی خوفناک گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ جس میں فریقین کا بہت نقصان ہوا۔ بالآخر چھیاسٹھ (۶۶) کے قریب سکھ جن میں بائیس (۲۲) کے قریب زخمی تھے۔ ریاست پٹیالہ میں بھاگ کر پناہ گزیں ہوئے۔ جہاں پر ان کا محاصرہ کرکے گرفتار کرلیا گیا اور اُس رات انہیں شیرکوٹ کے قلعہ میں بند رکھا گیا۔ اس شکست کے ساتھ ہی پنجاب میں کوکوں کی بغاوت کا خاتمہ ہوگیا۔ مسٹر کوون (KOWAN) نے جو اُن دنوں لدھیانہ کا ڈپٹی کمشنر تھا۔ ۱۷ر جنوری کو ریاست کے حکام کو لکھا کہ قیدیوں کو مالیر کوٹلہ بھیجدیا جائے۔ جہاں کرتہ

خود بھی اسی دن پہنچ گیا۔ اور اسی شام کے وقت اس نے اپنے قریبی افسر یعنی کمشنر علاقہ کو رپورٹ کی کہ تمام باغیوں کو تقریباً نیست و نابود کر کے مکمل امن قائم کر دیا گیا ہے۔ نیز یہ کہ میرا ارادہ ہے کہ گرفتار شدہ باغیوں کو کل توپوں سے باندھ کر اڑا دیا جائے لیکن دوسرے دن دوپہر کے وقت یعنی 17۔ جنوری کو اسے مسٹر فورسیتھ Forsyth کمشنر کا یہ پیغام پہنچا کہ ابھی قیدیوں کو شیرکوٹلے کے قلعہ میں ہی رکھا جائے جبتک کہ ایک حفاظتی دستہ ان کو واپس لانے کیلئے لدھیانہ سے نہ بھیج دیا جائے مسٹر کووان COWAN کہتا ہے کہ میں نے اس تحریری حکم کو تو جیب میں ڈال کر تقریباً فراموش کر دیا اور قیدیوں کا منتظر رہا۔ چنانچہ شام کے چار بجے کے قریب کوکے قیدی مالیرکوٹلے میں پہنچائے گئے۔ جنہیں دیکھتے ہی مسٹر کووان COWAN نے بغیر کسی قسم کی نمائشی عدالت سے حکم لینے کے فی الفور توپوں سے باندھ کر اڑا دینے کا حکم دے دیا۔ ان بدقسمت انسانوں کی تعداد پچاس تھی۔ جن کو اسی وقت چھ چھ کی ٹولیاں بنا کر توپوں سے باندھ کر اڑانا شروع کر دیا گیا۔ شام کے سات بجے کے قریب آخری چھ قیدیوں کی ٹولی کو توپوں سے باندھ چکے تھے۔ جب مسٹر فورسیتھ Forsyth کا یہ حکم پہنچا کہ قیدیوں کو فی الفور اس کے پاس لدھیانہ بھیج دیا جائے جہاں کہ ان پر بغاوت کا

مقدمہ چلایا جائیگا۔ چنانچہ مسٹر کوون COWAN نے جو جواب گورنمنٹ کو بعد میں دیا اس میں اس حکم کے متعلق اُس نے ذیل کے فقرات لکھے کہ "میں نے اس حکم کو پڑھ کر کاغذ مسٹر پرکینز Perkins کے حوالے کرتے ہوئے کہا کہ توپوں کے ساتھ باندھ دیئے جانے کے بعد یہ ناممکن ہے کہ ایسی حالت میں قیدیوں کی سزائے موت ملتوی کر دی جائے کیونکہ اس کا اثر ہمارے اردگرد جمع شدہ لوگوں پر بہت برا پڑیگا۔" چنانچہ پہلے تینتالیس (۴۳) قیدیوں کی طرح آخری چھ قیدیوں کو بھی ہلاک کر دیا گیا۔ پچاسواں (۵۰) آدمی بھی اُسی طرح اُڑا دیا جاتا۔ مگر اُس نے کسی طرح حراست کے سپاہیوں سے مخلصی حاصل کر کے مسٹر کوون COWAN پر حملہ کر دیا اور اس کو ڈاڑھی سے پکڑ لیا۔ مگر ہندوستانی افسروں کی سنگینوں نے اُسی وقت اُس کو وہیں ختم کر دیا جو وہاں پر موجود تھے۔ یہ سرگذشت ہے اُس واقعہ کی جس میں مسٹر کوون COWAN نے اتنی سرگرمی کا اظہار کیا۔ چونکہ مسٹر فورسیتھ Forsyth نے بار بار اس امر پر زور دیا تھا کہ باغیوں کو سزا دینے سے پہلے ان کو عدالت کے سامنے پیش کرنا ضروری ہے اس لئے ۱۷۔ جنوری کو اس نے گورنمنٹ کو بذریعہ تار اطلاع دی کہ "میں موقع پر موجود ہوں۔ اس لئے قاعدے اور قانون کے مطابق بغیر مزید تاخیر کے مجرمین

کو قرار واقعی سزا نہ دی جائے گی۔ اس وقت کسی غیر معمولی قدم کے اٹھانے کی مطلقاً ضرورت نہیں۔ ورنہ اندیشہ ہے کہ دبا ہوا جوش پھر عود نہ کر آئے"۔ لیکن ۱۸ جنوری کو جب مسٹر کووَن COWAN نے اس خوفناک حادثہ کی تفصیل سے آگاہ کیا۔ جس میں اس نے اس قدر یادگارِ زمانہ شجاعت کا اظہار کیا تھا تو کمشنر صاحب نے ذیل کے جواب سے اپنی خوشنودی کا اظہار کیا۔" اس قضیئے کو نپٹانے کے لیئے جو قدم آپ نے اُٹھایا ہے میں اُس کی پوری تصدیق کرتا ہوں۔ کیونکہ آپ نے اس معاملہ میں پوری قابلیت کا ثبوت دیا ہے۔ اس لیئے میں بھی فی الفور موقع پر پہنچتا ہوں"۔ چنانچہ آپ مالیر کوٹلہ پہنچے اور مفروضہ قانون کے منشاء کو پورا کرنے کے لیئے باقی ۱۶۔ قیدیوں کو بھی پھانسی کی سزا کا حکم سُنا دیا۔ جو اُسی وقت پھانسی پر لٹکا دیئے گئے۔

جب اس روح فرسا حادثہ کی اطلاع گورنمنٹ کو پہنچی تو اس نے مکمل غور کے بعد ذیل کی قرار داد کے ذریعہ اپنی رائے کا اظہار کیا:-

> "ہز ایکسیلنسی اور ممبران کونسل اس رنجدہ حقیقت کا اظہار ضروری سمجھتے ہیں کہ اُن کی رائے میں مسٹر کووَن COWAN کا طرزِ عمل نہ صرف سراسر قانون کے خلاف تھا بلکہ بے باک ضرورت

کے بھی منافی تھا - نیز اس تمام واقعہ میں بعض ایسے حوادث
پیش آئے ہیں جنہیں انسانیت اور تہذیب کے ساتھ دُور کا بھی
تعلق نہیں "۔

بنابریں جناب وائسرائے دلی رنج کے ساتھ اس حکم کے صادر کرنے پر مجبور ہوئے ہیں کہ مسٹر کووان COWAN کو فی الفور نوکری سے برطرف کیا جائے - لیکن دوسری طرف مسٹر فورسیتھ Forsyth — کے طرز عمل پر سختی سے نکتہ چینی کی گئی اور اُسے ایک اور صوبے میں کمشنر کی حیثیت میں سابقہ تنخواہ پر تبدیل کر دیا گیا۔ اور کچھ عرصے کے بعد یارقند کے علاقہ میں پولیٹیکل خدمت پر مامور کیا گیا - جہانکہ حُسن خدمات کے صلے میں سرداری یعنی (KnightHood) کا اعزازی خطاب مرحمت کیا گیا۔

اس حادثہ کے وقوع پذیر ہونے اور متذکرہ صدر احکام کے نافذ ہونے کے بعد ہندوستان میں رائے عامہ دو جماعتوں میں تقسیم ہو گئی - افسران کی جماعت اور اینگلو انڈین کی ہمدردی تو عام طور پر مسٹر فورسیتھ Forsyth اور مسٹر کووان COWAN کے ساتھ تھی - لیکن باوجود اس کے کہ ہندوستانی اخبارات کی آواز بہت کمزور تھی - پھر بھی جو ہولناک طرز عمل روا رکھا گیا تھا - اس کے خلاف آواز بلند کی گئی - میری ذاتی رائے

ہیں تو میں اپنی تمام ملازمت کے زمانہ میں متذکرہ پھانسیوں سے زیادہ بکردہ اور رنجیدہ واقعہ کوئی پیش نہیں کر سکتا۔

یہ صرف اکیلی میری ہی رائے نہیں بلکہ کثرت سے ایسے اشخاص موجود ہیں جو میرے ہم خیال تھے۔ بلکہ مستقبل بھی اس رائے کا اظہار کرے گا۔ کہ سنگدلی کے اس مظاہرہ کے بعد گورنمنٹ ہند نے جو سزا دی وہ نہایت ہی ناکافی تھی" [1]

سر ہنری کاٹن (Sir Henry Cotton) نے جس طرح اس واقعہ پر اظہار رائے کیا ہے وہ کسی مزید اضافے کا محتاج نہیں لیکن ممکن ہے کہ سر ہنری کے متذکرہ صدر فیصلہ کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھا جائے۔ اس لئے میں نے یہ مناسب سمجھا کہ سر ڈگلس فورسیتھ (Sir Douglus Forsyth) کی اپنی رائے کو پیش کر دیا جائے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ:۔

"بہ حیثیت کمشنر اور ہندوستانی ریاستوں کے سپرنٹنڈنٹ ہونے کے سزائے موت دینے یا جان بخشی کرنے کا اختیار صرف مجھے ہی حاصل تھا۔ نہ کہ مسٹر کوون COWAN کو۔ چنانچہ میں نے لودھیانہ سے اس کو صاف طور سے حکم بھیجدیا تھا کہ وہ صرف مجرموں کا قانونی طور پر مقدمہ کرے۔ لیکن سزا اس وقت تک ہرگز نہ دے جبتک کہ میں خود وہاں پر پہنچ نہ جاؤں۔ مگر

---

[1] Cotton, India & Home Memories.

مسٹر کوون COWAN نے قانون کو اپنے ہاتھ میں لے کر نہ صرف میرے حکم کے ماننے سے انکار کر دیا بلکہ اپنے آدمیوں کو حکم دے دیا کہ وہ ملزموں کو توپوں سے باندھ کر اڑا دیں۔"

"مسٹر کوون COWAN کی طرف سے جب مجھے یہ اطلاع ملی تو میں نے اُس تمام قانونی خلاف ورزی کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر لینی پسند کی۔ بنا بریں میں نے اُس کو فی الفور ایک خط لکھا کہ بحالاتِ موجودہ تم نے جو قدم اٹھایا ہے میں اُس کی تصدیق کرتا ہوں۔" "جس وقت کہ وہ ملازمت سے سبکدوش کر دیا گیا تو میں نے حتی الامکان اس کی امداد کرنے میں کوئی کوتاہی نہ کی۔ چنانچہ میں نے ہندوستان میں ہی اُسے ایک اچھی ملازمت پر نوکری دے دی"۔ ۱؎

مالیر کوٹلہ کا حادثہ فاجعہ بھی اُن کثیر حوادث میں سے ایک ہے جن میں خصوصیت کے ساتھ اگرچہ اینگلو انڈین اخبارات نے ایسے حوادث کے حق میں نہایت بلند آہنگی سے مضامین لکھے۔ لیکن اس کے باوجود گورنمنٹ انڈیا نہایت مجبوری اور بددلی کے ساتھ ہندوستانی رائے عامہ کے سامنے جھکی اور اُسے یہ تسلیم کرنا پڑا کہ اس کے افسران سے بھی غلطیاں ہو سکتی ہیں۔ مزید براں غدر

۱؎ Autobiography & Reminiscences of Sir Dougles Forsyth, P. 36, 37, 42.

کے چودہ سال کئے بعد گورنمنٹ نے بادلِ ناخواستہ اس امر کو تسلیم کیا کہ انسانوں کو توپوں سے باندھ کر ہلاک کرنا ایک وحشیانہ فعل ہے۔ مگر مفروضہ عدالتی کارروائی کے بغیر بیشمار انسانوں کو اس طرح بیدردی سے ہلاک کردینے کی کارروائی بھی صرف پنجاب کا ہی خاصہ ہے۔ چنانچہ اس سے پہلے بھی معمولی جرائم پر "فی الفور درشت انتقامی کارروائی" کرنے کی پالیسی پر عمل کیا جاتا رہا ہے جس کو یہاں کے حکام نے ہمیشہ پسند کیا اور بیحد تعریف کی۔ جس طرح ہم ان مظالم کی سرگذشت سُن کر جو فرانس اور پرشیا کی لڑائی میں روا رکھے گئے تھے "پستہ قد نپولین" کو ہی ان مظالم کا ذمہ دار گردانتے ہیں حق بجانب ہیں تو اسی طرح پنجاب کے اس ہولناک حادثہ کو بھی غدر کے اُس "پستہ قد نکلسن" کے افعال اور مظالم کا نتیجہ قرار دینے میں زیادہ مجبور نظر آتے ہیں۔

(۴)

میں قارئین کرام کو افغانستان کی دوسری لڑائی کی اُلجھی ہوئی سرگذشت سُنانا نہیں چاہتا۔ لڑائی کچھ عرصہ کے لئے بند ہو گئی اور ایک عہد نامہ کی رُو سے سر لوئی کیویگناری (Sir Louis Cavangnari) کو ہمارے سفیر کی حیثیت سے کابل میں متعین کیا گیا۔ اگرچہ اس کی سلامتی کے متعلق لارڈ لارنس (Lord Lawrance) کو اطمینان نہ تھا۔ چنانچہ یکایک یہ اطلاع ملی کہ ہمارا سفیر اپنے تمام ساتھیوں

کے سمیت قتل کر دیا گیا۔ اور ریذیڈنسی کے مکان کو جلا دیا گیا۔ اس خبر کے سنتے ہی لارڈ رابرٹس Robarts نے پھرتی کے ساتھ فوج کو کوچ کا حکم دے دیا۔ اور اکتوبر میں کابل پر قبضہ کر لیا۔ شجاعت اور تدبر کی یہ ایسی زریں مثال ہے جو دنیا میں آج بھی ویسی ہی چمکتی ہے۔ قبضہ کرنے کے بعد انگریزوں کے قتل اور جھنڈے کی بے عزتی کی بنا پر سخت انتقامی کارروائی شروع کی گئی۔ جس کی تفصیل درج ذیل ہے:۔

"فوجی قانون یعنی مارشل لا کا فی الفور اعلان کیا گیا اور لوگوں کی ٹولیاں بنا کر دھڑا دھڑ پھانسیاں دینی شروع کر دی گئیں اور ساتھ ہی امیر یعقوب خان کو ہندوستان میں جلاوطن کر دیا گیا۔ فصلوں کو بے دردی سے تباہ کیا گیا اور دیہات کو بیدریغ آگ کی نذر کیا گیا"[1]

"میں کسی کو بھی اُس وقت تک مجرم قرار دینے کے لئے تیار نہیں ہو سکتا۔ جبتک جرم کے یقین میں ثبوت نہ مل جائے۔ حالانکہ وزارت خارجہ کا یہ حکم تھا کہ "سزا کم سے کم عرصہ میں۔ سخت اور عبرتناک" دی جائے۔ مگر یہ تو اُسی وقت ہو سکتا ہے جب مجرم کے متعلق ہمیں پہلے سے پوری واقفیت حاصل ہو۔ ورنہ ہمیں تو بہرحال سزا دیتے وقت پوری تحقیقات

[1] Cotton, Indian & Home Memories, P. 172.

کرنی لازمی ہونگی۔ میں تو ہرگز یہ یقین نہیں کر سکتا کہ بیدریغ قتل و غارت سے ہمیں کوئی فائدہ مترتب ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں اس قسم کی کارروائی میں کبھی امداد نہیں دے سکتا"[1]

"۲۲۔ اکتوبر۔ آج پانچ آدمیوں کی جان بچائی۔ یعنی میں اگر ان کے معاملے میں بروقت مداخلت نہ کرتا تو یہ غریب ہلاک کر دیئے جاتے۔ ان میں سے ایک ملزم ابوبکر نامی ایک معمر آدمی تھا جس کے برخلاف سب سے خطرناک مگر بالکل بے بنیاد گواہی اس کے ایک بدترین دشمن کی تھی"[2]

"سر ڈانلڈ سٹیوارٹ Sir Donald Stewart کی بجا طور پر تعریف کرنی چاہیئے۔ کیونکہ اس نے ہمیشہ اس قسم کے وحشیانہ مظالم کی مخالفت کی تھی"[3]

"کابل جو ہمیشہ خونریزی اور بدامنی کیلئے بدنام تھا۔ اب شہر خموشاں کی طرح بے حس و حرکت ہے۔ اس لئے کہ پھانسی کا بھوت تمام شہر پر سایہ فگن ہے۔ یہانتک کہ اس کے اثر سے وہ بدمعاش بھی نہیں بچ سکے جو شہر کے تنگ و تاریک گوشوں میں پناہ گزیں ہو کر اپنے آپ کو محفوظ سمجھا کرتے تھے۔ پٹھانوں کو قتل و غارت کی جرأت محض اس بھروسے پر ہوئی کیونکہ وہ اس سے پیشتر ہی

---

1. Life & opinions of Sir Sharles Macgreger (Roberts chief of the staff) ii, p. 136, Entry in Diary
2. Macgreger, ii, p. 140-141, 3. Cotton, p. 172.

سمجھے ہوئے تھے کہ ہم فطرتاً رحمدل ہیں۔ لیکن جدید درشت پالیسی کے زیر اثر انتقام لینے کے جو ہولناک طریق ہم نے اختیار کئے ہیں ان سے اُن کی آنکھیں کُھل گئی ہیں۔ جنرل پولک Pollock کی طرح اگر جنرل رابرٹس چاہتا تو تمام بازاروں کو ویران کر کے کابل کو اس کی قسمت پر چھوڑ دیتا۔ لیکن خواہ ہم کابل سے واپس جائیں یا یہیں پر قابض رہیں۔ یہ ناممکن ہے کہ عرصہ دراز تک ہمارے جلادوں کے افسانے دیہات اور شہروں میں بسنے والے پٹھانوں کی یاد سے محو ہو جائیں۔ مزید براں ابھی کون کہہ سکتا ہے۔ کہ اور کتنے بڑے بڑے آدمی پھانسی کے تختے کا انتظار کر رہے ہیں" [1]

"پھر اس کا کیا نتیجہ نکلا۔ یہی کہ اشتعال اور غصہ سے بھڑکے ہوئے قبیلوں نے ہزاروں کی تعداد میں اعلان جنگ کر دیا۔ اور آناً فاناً چاروں طرف سے تباہی اور بربادی کے بادل گھر گئے گو اس تاریکی میں شجاعت اور دلیری کے روشن کارنامے بھی سرزد ہوئے لیکن لارڈ رابرٹس Roberts نے کابل کے نواح میں موضع شیرپور میں اپنے آپکو نہایت ہی خطرناک حالت میں محصور پایا" [2]

---

[1] The Afghan War 1879-80, P. 139 by Howard Hensman: corrispondent pioneer (Allahabad) The daily News (London) [2] Cotton, P. 172.

"سرچارلز میکریگر Sir Charles Macgregor نے اپنے زیر اہتمام افغانستان کی دوسری لڑائی کے متعلق ایک بڑی ضخیم کتاب کو ترتیب دینے کا اہتمام کیا جو چھ جلدوں میں تیار ہوئی۔ لیکن گورنمنٹ ہند کے حکم سے اس کی اشاعت روک دی گئی" [1]

یہ اخبار نویس جس کے مضمون کا حوالہ ہم پہلے دے چکے ہیں حسب معمول بعض مشہور فوجیوں کے مقابلہ میں زیادہ تند خو ثابت ہوا ہے۔ چنانچہ اُس نے اس مضمون کے آخر میں یہ پیشگوئی بھی کردی تھی۔ کہ کابل کے واقعات کے خلاف انگلستان کے "احمق اور جاہل طبقہ" کی طرف سے یقیناً مخالفت کی جائے گی۔ جو بعد میں حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی۔ ایک اور اعتراض جو اس مضمون کے دوران میں مجھے کھٹکا تھا، یہ ہے کہ "افغانستان ہمیشہ ہی ایک خاموش مگر دغاباز دشمن ثابت ہوا ہے"!

(۲)

غدر سے مغلوب شدہ دماغ کی پراگندگی کی تیسری مثال اپریل ۱۹۱۹ء میں امرتسر کے جلیانوالہ باغ کا حادثہ ہے جس کی ٹیس ہندوستانی دماغوں میں تاحال محسوس ہو رہی ہے۔ اس واقعہ کی تفصیل میں جانے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ جنرل ڈائر Dyer کی حالت کا بغور مطالعہ کیا جائے کہ وہ اس وقت کس قدر خطرناک

---

[1] Dictionary of National Biography

مشکلات میں گھرا ہوا تھا۔ اگرچہ آج سے ساٹھ سال پہلے امرتسر کو
Cooper کے سنگدلانہ مظالم کی جولانگاہ رہ چکا تھا۔ پھر بھی ا
وقت یہ شہر سکھوں کی مذہبی دیوانگی اور حب الوطنی کا مرکز تھا
چنانچہ عام بے اطمینانی اس حد تک فروغ حاصل کر گئی تھی۔
اس پر کوئی قابو نہ رہا تھا۔ یہانتک کہ عام پبلک نے نہایت وحشی
قتل کا اقدام کیا۔ اور ایسی ہی مذموم حرکات کرنے پر تلی ہو
تھی۔ مزید برآں انہوں نے عیسائی لڑکیوں کے سکول میں آگ
دی۔ مگر اتفاق سے غریب بچیوں کی جانیں آگ کی نذر نہ ہو سکیں
لیکن دوسری طرف باغ میں جلسے کا انعقاد اس غرض سے عم
میں نہیں لایا گیا تھا۔ کہ وہاں پر امن اور سکون سے کسی متنازعہ
فیہ مسئلہ کا حل تلاش کرنا تھا۔ اور نہ ہی وہ غیر مسلح تھے۔ سوائے
اس حالت کے اُن کے پاس بندوقیں وغیرہ نہیں تھیں۔ عوام
میں اکثر تو لاٹھیوں سے مسلح تھے اور بعض تو بڑے بڑے لٹھ
اُٹھائے ہوئے تھے۔ جن سے عام طور پہ ہندوستانی کسان اپنی
حفاظت کیا کرتے ہیں۔ انہی اوزاروں سے انہوں نے بعد میں
قتل و غارت شروع کی۔ جنرل ڈائر چھوٹے سے فوجی دستے کو
لے کر جلسہ گاہ میں پہنچا اور انسانوں سے بھرے ہوئے نشیبی قطعہ
میں فی الفور گولی چلانے کا حکم دے دیا۔ چنانچہ دس منٹ کے اندر
اندر اس نے انسانوں کی اتنی تعداد کو ختم کر دیا جتنی کہ جنگ افریقہ

میں سپی این کوپ (Spion kop) کی خونریز ترین لڑائی میں دو دن کی مسلسل اور پیہم جنگ کے بعد ضائع ہوئی تھی۔ یہاں پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ فوجی ضرورت کے لحاظ سے اُس کا یہ فعل صحیح نہیں تھا۔ کیونکہ وہ اس وقت تک گولی چلاتا رہا۔ جبتک کہ بارود ختم نہیں ہو گیا۔ یعنی اُس نے اُس سنجیدہ امانت کا جو اُس کے سپرد کی گئی تھی۔ نہایت بُری طرح استعمال کیا۔ چنانچہ اپنی شہادت کے دوران میں اُس کا یہ مقصد تھا کہ وہ ایسی سخت کارروائی کرے جس سے لوگوں میں ہیبت پھیل جائے اور دُور دُور تک اُس کا اثر پڑے۔ اگرچہ اس شہادت سے اُس نے اپنے ساتھ خود دشمنی کی ہے اور کسی کے لئے کوئی گنجائش نہیں چھوڑی کہ کوئی اُس کے حق میں ایک لفظ بھی کہہ سکے مگر پھر جس بیخوفی اور دیانتداری سے اس نے شہادت دی ہے اس کیلئے اس کی خواہ مخواہ تعریف کرنی پڑتی ہے۔ لیکن زخمیوں کو بغیر طبی امداد کے پڑے رہنے دینا اور ایک ایسی جگہ کو لاشوں اور زخمیوں سے بھرے ہوئے دیکھ کر بھی رات بھر لوگوں کی امداد سے بند کر رکھنا ایسا دردناک منظر ہے۔ جس پر اس وقت بحث کرنا ضروری نہیں سمجھتا۔ البتہ آگے چل کر اظہار خیال کرونگا۔

لیکن اس وقت تو ہمارا مبحث یہ ہے کہ جو کارروائی ہم نے جلیانوالہ باغ میں کی۔ یا اس کے بعد جو شورہ ہنگامہ انگریزوں نے برپا کیا۔ اُس کی تہہ میں وہی جذبۂ انتقام نظر آتا ہے اور ہمارے دماغوں پر وہی بحث طاری ہے جو حادثۂ کانپور کی خبر سُننے کے بعد یا باغیوں کے ہاتھوں انگریز مستورات کی بے حرمتی کی بے بنیاد اطلاعات پہنچنے کے بعد ہوئی تھی

یعنی ہم توازنِ دماغ کھو بیٹھے تھے۔ چنانچہ اس وقت بھی ہماری حالت بعینہ یہی تھی۔ یعنی خطرے سے عہدہ برا ہونے کیلئے ہم نے فی الفور ہی سنگدلانہ حرکات کرنی شروع کردیں۔ جو بندر کیوقت موثر ثابت ہوئی تھیں چنانچہ پندرہ منٹ کے اندر اندر جلیانوالہ باغ میں پندرہ سو (۱۵۰۰) انسانوں کو ختم کردیا گیا۔ حالانکہ ہندوستانی تو یہ دعوے کرتے ہیں کہ مقتولین کی تعداد اس سے بھی کہیں زیادہ تھی۔ مگر یہ وہ تعداد ہے جسے سرکاری طور پر پبلک تحقیقات کے وقت تسلیم کیا گیا تھا۔ اگرچہ سرکاری افسران کے دماغ اپنے ہمعصر فوجی افسر کے اس وحشیانہ فعل سے حواس باختہ ہوگئے تھے۔ لیکن اس کے باوجود وہ اس کو حق بجانب کہنے پر مجبور تھے۔ چنانچہ اس امر کی پوری کوشش کی گئی کہ اس ہولناک خبر کی اشاعت نہ ہو سکے۔ مگر وہ ناکام رہے اور یہ خبر بجلی کی رو کی طرح ہندوستان کے گوشے گوشے میں پہنچی یہانتک کہ تیس کروڑ ہندوستانیوں کو تڑپا کر ایک متحدہ محاذ پر کھڑا کردیا۔ یہ ایک ایسا زبردست نتیجہ ہے جو ہزار سال سے ہندوستان میں کبھی نہ ہوا تھا۔ اور ویسے بھی یورپین قوم کے لئے ایک نہایت ہی زبردست خطرہ ہے۔ دوسری طرف ہنٹر کمیٹی Hunter Committee کی معتدل رپورٹ شائع ہونے کے بعد اینگلو انڈین اخبارات میں بے انتہا گمنام چٹھیاں شائع کرکے اس رپورٹ سے بیزاری کا اظہار کیا گیا۔ اور ساتھ ہی ساتھ جنرل ڈائر Dyer کی حسن خدمات کے صلے میں تیس ہزار پونڈ کی رقم انگریزی قوم سے چندہ کرکے جمع کی گئی جسکا بیشتر حصہ

ہندوستان میں مقیم انگریزوں کی جیبوں سے فراہم کیا گیا تھا۔ یقیناً اس وقت بھی ایسے یورپین ہندوستان میں موجود ہونگے جنہوں نے محسوس کیا ہوگا۔ کہ اس ذلیل ذہنیت کا اظہار کر کے ان کی قوم نے نہ صرف اپنے آپکو بیوقوف بنایا ہے بلکہ دنیا کی نظر میں ذلیل و رُسوا کیا ہے۔

(۶)

اگر ہمیں بہتر تعلیم نہ دی گئی تو ہم اسی طرح معمولی سے اشتعال پر بھی دنیا کی نظر میں بیوقوف بنتے رہیں گے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ہم نے جنرل ڈائر Dyer کی اس مذموم حرکت کے خلاف نفرت و حقارت کی آواز بلند کرنے کے حق کو زائل کر دیا ہے۔ کیونکہ اجتماعی حیثیت میں ہم سب ذمہ دار تھے۔ وہ ہمارا نمائندہ تھا۔ اور ہمارے مقابلے میں زیادہ دلیر اور کم بیوقوف تھا۔ لیکن اُس کے اس طرزِ عمل کے ذمہ دار براہ راست وہ خیالات تھے جو ہندوستانیوں کے متعلق غدر کے بعد سے ہم نے اپنے اسلاف سے وراثت میں حاصل کئے تھے۔ یعنی کوپر Cooper اور کوون Cowan کے بھوت یقیناً اُس وقت جلیانوالہ باغ کے ارد گرد منڈلا رہے تھے۔

مجھے سخت تعجب ہوگا۔ اگر ان واقعات کے مطالعہ کے بعد بھی ناظرین میرے ساتھ اس امر میں متفق نہ ہونگے کہ غدر کے متعلق جو حالات ہماری تواریخ میں قلمبند کئے گئے ہیں ان پر نظر ثانی کی سخت ضرورت ہے کیونکہ اگر کوئی چیز اُن کی کامل تشفی نہ کر سکے تو کم از کم یہ تو

ایک کھُلی ہوئی حقیقت ہے کہ ان تمام واقعات کے بیان کرنے میں ایک دوسرے کی تردید تو نمایاں طور سے دکھائی دیتی ہے۔ مگر بایں‌ہمہ یہ صرف کانپور یا میرٹھ کے خونی واقعات کے جوش کا نتیجہ نہیں۔ بلکہ ناظرین جو عام حالات میں واقعات کو تنقید کی عینک سے پرکھنے کے عادی ہوا کرتے ہیں۔ غیر محسوس طور پر متاثر ہو کر اُنہی بیانات کو صحیح تسلیم کر لیتے ہیں خواہ اُن میں کتنا ہی تضاد کیوں نہ ہو۔ یا واقعات کو توڑ مروڑ کر ہی پیش کیا گیا ہو بلکہ اکثر دفعہ تو وُہ ایسے معمولی سوالات سے بھی گریز کرتے ہیں جن پر ایک دو سکنڈ کے غور سے پیش کردہ بیانات کی لغویت ظاہر ہو جاتی ہے۔ بہر کیف جب وقتی جوش کے سحر کا اثر زائل ہو جاتا ہے تو دماغ اُن حوادث کی خفیف سی یاد پر بھی منصفانہ غور و خوض کے لئے آمادہ ہوا کرتا ہے بشرطیکہ خیال اور عمل کے قوائے ہمیشہ کے لئے شل اور بیکار نہ ہو چکے ہوں۔ غدر کو گذرے ہوئے ابھی ستّر (۷۰) سال ہوئے ہیں لیکن اس قلیل مدّت میں بھی گو اِس موضوع پر بیشمار کتابیں لکھی گئی ہیں پھر بھی اس کو اِس حد تک صاف بیانی اور تحقیق سے پبلک کے سامنے پیش نہیں کیا گیا۔ بخلاف اُن واقعات و حوادث کے کہ جن کو گذرے ہوئے صدیاں ہو چکی ہیں۔

غدر کے بہادروں میں ایک قسم کی یکسانیت پائی جاتی ہے مجھے یاد ہے کہ بچپن میں جان نکلسن John Nicholsen سے مجھے ایک گونہ فریفتگی تھی۔ اس لئے میں نے اس کی زندگی کے حالات

معنفہ ٹراٹر Trotter کا مطالعہ کیا۔ جسے اب بھی بیشتر اصحاب پڑھتے ہیں۔ اس کتاب میں کسی زندہ انسان کو پیش نہیں کیا گیا بلکہ ایک "رواجی بزرگ" کی تصویر دکھائی گئی ہے جو ایک معمولی مصوّر کی شرمندۂ احسان ہے۔ اس کتاب سے زیادہ خشک اور بے رغبت کتاب شاید ہی کسی اور زبان میں لکھی گئی ہو۔ بااین ہمہ جان نکلسن John Nicholson زندہ تھا۔ لیکن اس کی دوسری خوبیوں یا بُرائیوں سے قطع نظر کرکے کم از کم اتنا تو وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ احمق نہیں تھا۔ اس کی سوانح کے مطالعہ سے دل میں ایک طرف تو پُر جوش محبت کے جذبات پیدا ہو جاتے تھے جو ایک قسم کی والہانہ پرستش تک پہنچ جاتے تھے۔ مگر دوسری طرف غم و غصّہ کی کیفیت بھی پیدا ہو جاتی تھی۔ اُس کی وفات ایسے وقت میں ہوتی ہے۔ جبکہ مغلوں کی قسمت کا آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ اور ایسے وقت میں اُس نے جان دی جبکہ ایک طاقتور شہر اپنی جملہ روایات کے ساتھ اُس کے قدموں کے نیچے آ رہا تھا۔ وہ ایک بجلی کی مانند چمکا اور دنیا نے اُس کی کڑک اور روشنی کو دیکھا۔ لیکن تھوڑے ہی وقفہ کے بعد فتحیاب جرنیل تو مردہ تھا۔ اگرچہ اپنے پیچھے وہ شاندار نتیجہ چھوڑ چکا تھا۔ سر جارج فاریسٹ Sir George Forest کی طرح یہ کہنا تو مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ کہ جان نکلسن انیسویں صدی کے دلیر افسران میں سے نہیں تھا۔ بلکہ شاہ آرتھر

Arther کے "مشہور زمانہ بہادر سرداروں KNIGHTS" کے مشابہ تھا۔ لیکن اس کے مقابلہ میں سر جارج کیمپبل Sir George Campbell اپنے مخصوص اور محتاط طریقے میں جان نکلسن کا جو خاکہ پیش کرتا ہے۔ وہ زندہ انسانوں کے مقابلہ میں زیادہ مشابہت رکھتا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ :-

"اگرچہ ذاتی طور پر میں اُس سے شناسا نہیں تھا۔ لیکن یہی خیال کیا کرتا تھا کہ وہ نہ صرف ایک مضبوط اور بہادر انسان ہے بلکہ اپنے بعض افعال میں تشدد کے استعمال سے بھی گریز نہیں کرتا۔ چنانچہ ان حالات کے علم حاصل کرنے کے بعد جو اُس کے مداحوں کی زبانی ہم تک پہنچے ہیں۔ ہمیں لامحالہ اب یہی کہنا پڑتا ہے کہ وہ بہت ہی تند خو انسان تھا۔ باسورتھ سمتھ (BOSWARTH SMITH) - نے لارڈ لارنس (Lawrence) کی سوانح حیات قلمبند کرتے وقت اگرچہ جان نکلسن - John Nicholson) - کی بے انتہا تعریف کی ہے۔ مگر اس کے بیان کردہ واقعات اس تعریف کے بالکل خلاف جاتے ہیں چنانچہ یہ بات تو یقینی طور پر مسلم ہے کہ وہ بہت سرکش اور گستاخ تھا یہاں تک کہ وہ نہایت نازیبا طریق سے لارڈ لارنس (Lawrence) تک سے بھی گستاخی سے پیش آیا" [1]

---

[1] Campbell i, P. 248, 249.

"نکلسن اور اس تماش کے اور سرکش اور گستاخ آدمیوں نے
لارڈ لارنس Lawrence کی شان میں "بوڑھی عورت"
کے آوازے کسے" [1]

کیمپبل (Campbell) نے نکلسن (Nichalson) ک
شہرت کے ...... متعلق روایات پر جس نفرت کا اظہار کیا
وہ مبنی بر انصاف نہیں کیونکہ ہمارے پاس اُن کے حق میں شہ
موجود ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ نکلسن Nicholoson
شہرت اور نامردی سے چڑ گیا تھا اور بہت ممکن ہے کہ شاہ آ
کے سرداروں والی تمثیل سننے کے بعد وہ اور زیادہ ہرزہ سر
کرتا۔ لیکن اس کا یہی تعصب صاف طور سے ظاہر کرتا ہے کہ کو
غیر معمولی شخصیت بروئے کار تھی۔ جس کی بنا پر اس قسم کا اظہار کیا
بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نکلسن سے ملاقات کے سلسلے میں ہی نا
پیدا ہو گئی۔ نیز یہ بھی واضح رہے کہ غدر کے ایام میں اور اس
بعد بھی وہ ایسے اشخاص سے ملتا رہا جو نکلسن سے بخوبی واقف
تھے جن میں لارڈ لارنس (Lawrence) بھی ایک ہے۔ ناظ
بخوبی جانتے ہیں کہ کھانے اور ٹیبن کے بعد گفتگو کا انداز کیسا
ہے۔ چنانچہ ایسے اشخاص کے ساتھ جنہیں خود بھی غدر کے وا
سے کافی وابستگی تھی۔ اور اُن کی وجہ سے نکلسن کو شہرت حاصل ہ

---

[1] Campbell, i, 235.

یقیناً بہت سی گفتگوئیں ہوئی ہوں گی جن میں نکلسن کا ذکر کیا گیا ہو۔ جس کی تھوڑی سی جھلک تو سرکاری رپورٹوں میں بھی نظر آتی ہے۔

اسی طرح دوسری مشہور کتب کے مطالعہ سے مشاہیر غدر مثلاً نیل NEILL ہیویلاک Havelock اور ہوڈسن Hodson وغیرہ کے متعلق بھی طبیعت پر یہی اثر پڑتا ہے کہ وہ مذہبی گیت نہائت رغبت سے گایا کرتے تھے۔ اور ان کے ماتحت سپاہی ان سے بے انتہا عقیدت اور پرستش کا اظہار کیا کرتے تھے۔ لیکن اس وقت کے سرکاری کاغذات کے سرسری مطالعہ سے انسان کو معلوم ہوتا ہے کہ ان بہادروں کے مشاغل اس کے علاوہ بھی تھے چنانچہ سرجارج کیمبل لکھتا ہے کہ:۔

"نیل (Neill) اُن انسانوں میں سے ہے جنہوں نے شہرت اور ناموری کے زینہ تک نہائت ہی بزدلانہ تشدد کی کارروائیوں سے رسائی حاصل کی ہے۔ اور اُس وقت اُس کی اچانک موت کی وجہ سے اعتراض اور نکتہ چینی روک دی گئی تھی۔ لیکن اب جبکہ اُس کا نام قدیم تاریخ میں شامل ہو چکا ہے تو اُن غیر جانبدارانہ اطلاعات کی بنا پر جو مجھے حاصل ہوئیں، نہائت وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اس میں کوئی خاص خوبی نہیں تھی۔ چنانچہ مسلسل سفاکی اور خونریزی کی کارروائیوں کو جس طرح جنرل نیل (Neill) نے پسند کیا اور

---

a Campbell, i, 235.

لدھیانہ کی پلٹن کے تلف ہونے میں جس عدم تدبر اور انتہائی نااہلیت کا ثبوت دیا۔ یز الہ آباد میں تشدد اور عدم اعتماد کی پالیسی نے فیروز پور کی پلٹن کو تقریباً بغاوت پر آمادہ کردیا۔ حالانکہ وہ میرے نزدیک لودھیانہ کی پلٹن کے بعد ایک عزیز اور قابلِ قدر پلٹن تھی۔ متذکرہ صدر ناعاقبت اندیشانہ حرکات ایسی ہیں۔ جن کی بنا پر جنرل نیل کو کبھی معاف نہیں کیا جاسکتا۔"[1]

(۷)

وہ دن دور نہیں جب ہماری خواندہ پبلک کے سامنے غدر کے صحیح اور مستند حالات پیش کئے جائیں گے جو سابقہ تواریخ کیطرح محض پراپیگنڈا کی خاطر مرتب نہیں ہونگے کہ جس سے پڑھنے والے کے دماغ میں انگریز تو فرشتۂ رحمت کی طرح ظاہر ہوں اور ہندوستانی ظلمت و جہالت کے پیامبر بتائے جائیں۔ اگرچہ ہمارے بعض مورخین نے جھانسی کی رانی کے حالات قلمبند کرتے ہوئے دبی زبان سے اسکی بہادری کے کارناموں کا ذکر کیا ہے باغی افسران میں سے مہارانی غالباً سب سے زیادہ بہادر اور قابل تھی۔ یہاں تک کہ سر ہیو روز Sir Hugh Rose جس نے رانی صاحبہ کو شکست دی تھی اس نے بھی مہارانی کے حق میں تعریفی جملے استعمال کئے ہیں جس بہادری اور شجاعت سے مہارانی صاحبہ ہمارے خلاف لڑی۔ یہاں تک

---

[1] Campbell, i, 281, 282.

کہ میدانِ جنگ میں لڑتے لڑتے جان دیدی۔ ہندوستانیوں کے نزدیک مہارانی لکشمی بائی یا جھانسی کی رانی ویسی ہی مقبول اور معزز ہے جیسی کہ جون آف آرک (Joan of ark) فرانسیسیوں کے نزدیک۔ چنانچہ ایک دن یہ حقیقت بھی ہمارے سامنے بے نقاب ہو جائیگی جس سے ہم بخوبی سمجھ سکیں گے کہ وہ حالات کیا تھے جن کی بناء پر مستورات اور بالخصوص ہندوستانی مستورات کے دلوں میں ہماری قوم کے خلاف اس قدر شدید نفرت و حقارت کا جذبہ کیوں پیدا ہوا۔ جس نے انہیں مجبور کر دیا کہ وہ ہمارے خلاف مسلح ہو کر میدانِ جنگ میں نکل آئیں۔ صرف جھانسی کی رانی اور اُس کی بہن نے ہی ہمارے خلاف غدر میں حصہ نہیں لیا بلکہ اُن کے علاوہ اور بھی مستورات اس جنگ میں شامل ہوئیں۔

"جھانسی میں انگریز مردوں، عورتوں اور بچوں کو نہایت بے ایمانی سے بیدریغ قتل کیا گیا جو اپنی شیطنت اور سفاکی کے اعتبار سے ایک چھوٹے سے پیمانہ پر کانپور کے خونی واقعہ سے مشابہت رکھتا ہے"[۱]

مہارانی صاحبہ نے اگرچہ عنانِ حکومت اس واقعہ کے تین دن بعد سنبھالی لیکن اس قتل و غارت کی ذمہ داری سے اس کا دامن پاک نہیں ہے بلکہ انگریز قوم کے خلاف جس نفرت و حقارت کا اظہار

۱؎ Oxford History of India, P. 721.

رانی صاحبہ نے بعد میں کیا۔ اس سے میں تو اپنے آپکو اس امر کے باور کرنے میں حق بجانب سمجھتا ہوں کہ اس تمام قتل و غارت گری میں مہارانی صاحبہ اور اس کا دلاور بابر کے شریک تھے۔ جسے جھانسی کی فتح کے بعد ہم نے اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتے ہوئے پھانسی کے تختہ پر لٹکا دیا۔ لیکن غدر کے اتنے عرصہ بعد بھی مورخین نے مہارانی صاحبہ کی نفرت کو ایک حد تک حق بجانب سمجھتے ہوئے اس کی بہادری کی بہت تعریف کی ہے۔

مونٹگمری مارٹن Mont Gomery Martin غدر کے اختتام کے زمانہ میں لکھتے ہوئے بتاتا ہے کہ اینگلو انڈین پریس نے ایک اور باغی لیڈر کی بھی تعریف کی ہے۔ جس کا نام شہزادہ فیروز شاہ ہے۔ جس کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے دہلی میں باغیوں کے ہاتھوں انگریزوں کے قتل عام کو بچانے کی بہت کوشش کی۔ چنانچہ یہ یقین رکھتے ہوئے کہ دہلی کی فتح کے بعد اُس کا پھانسی دیا جانا ایک لازمی امر ہے۔ پھر بھی وہ نہایت شجاعت اور استقلال سے میدان جنگ میں اس مقصد کی تکمیل کے لئے برابر ڈٹا رہا۔ اور بالآخر جب دہلی فتح ہوگئی تو وہ کسی طریقے سے جان بچا کر بھاگ نکلا جس پر اُس کے مخالفین نے بھی اس طرح فرار ہو جانے پر کسی قسم کے افسوس کا اظہار نہیں کیا۔ بلکہ ایک طرح سے اطمینان کا سانس لیا۔ اُس کی شہ زوری اور موت کی آغوش سے جوانمردی کے ساتھ صحیح و

سلامت رہنے کے واقعات۔ افسانوں کی صورت میں زبان زدِ خلائق ہیں۔ چنانچہ اس کے متعلق یہ یقین کیا جاتا ہے کہ وہ سنہ ۱۸۶۴ء تک ہندوستان کے جنگلوں میں چھپ کر زندگی بسر کرتا رہا۔ اور اس کے متعلق آخری اطلاع سنہ ۱۸۶۶ء میں یہ تھی کہ وہ عربستان میں ایک فقیر کی حیثیت میں دیکھا گیا [1]

(۸)

آج سے اکیسو سال بعد یقیناً ایکدن ایسا آئیگا جبکہ غدر کے متعلق تمام واقعات اور ہندوستانی روایات کا سختی سے احتساب کیا جائیگا۔ اور اس پر تعصب یا پروپگنڈا کی حیثیت سے نہیں بلکہ خاص تاریخی اعتبار سے نظر ڈالی جائے گی۔ جس کے بعد وہ ایک مستند صورت میں دنیا کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ یقیناً غلامانہ زندگی کی یہ ایک نہایت ہی خوفناک کہانی ہوگی۔ چنانچہ اس کے بعد ہمارے لئے یہ ناممکن ہوگا کہ ہم کانپور کے سفاکانہ قتل و غارتگری کے واقعہ کو یہ کہہ کر اپنے سر سے

---

[1] نوٹ :۔ یہ غلط ہے کہ شہزادہ فیروزشاہ انگریزوں کے قتل عام کے وقت دہلی میں موجود تھا کیونکہ وہ غدر سے پہلے مکہ معظمہ گیا ہوا تھا۔ جہاں سے وہ ہندوستان کے ساحل پر اس وقت اترا جب غدر پھیل چکا تھا۔ چنانچہ یہ سمجھ کر کہ غدر دراصل ہندوستان کی آزادی کیلئے جنگ ہے وہ سیدھا میدان جنگ کیطرف روانہ ہوگیا۔ جہانکہ وہ انگریز بچوں اور عورتوں کے قتل عام کے بعد پہنچا۔ (مصنف)

ٹال سکیں گے کہ :۔

"غصّے اور انتقام کے صحیح جوش میں ہماری فوجوں نے نہایت خوفناک بدلہ لیا" [1]

یا یہ کہ :۔ "جنرل ہیولاک (Havelock) نے ۱۶۔ جولائی کے دن نانا صاحب کو شکست دے کر کانپور پر قبضہ کر لیا۔ جس کے بعد شہریوں سے بیجا طور پر نہایت بے رحمی اور سفاکی سے انگریزوں نے انتقام لیا" [2]

مجھے اندیشہ ہے کہ مصنّف کی معتدل تحریر کے باوجود ناظرین غدر کے واقعات کی سفّاکی اور بے رحمی کو ٹھنڈے دل سے پڑھ کر فراموش نہ کر سکیں گے۔ جس کا نمونہ ذیل میں دیا جاتا ہے :۔

"اگرچہ سرسری طریق سے باغی سپاہیوں کے خلاف منتقمانہ کارروائیاں عمل میں لائی گئیں۔ پھر بھی ان کو خلافِ انسانیت سمجھ کر ہمارے سپاہیوں کے خلاف سختی سے نکتہ چینی کی گئی۔ اور دوسری طرف لارڈ کیننگ (Canning) کو بعض اس وجہ سے مورد الزام قرار دیا گیا کہ اس نے باغیوں کے معاملات میں عفو و جاں بخشی کی پالیسی کو کیوں اختیار کیا۔ بہرکیف

---

[1] Oxford history, p. 719.

[2] Letters of Queen Victoria by A.C. Benson & Viscount, iii, p. 224.

سول اور فوجی افسران کی کارروائیوں کو عام طور پر پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا۔ کیونکہ انہیں کی سرگرمی اور قابلیت سے غدر کی آگ فرو ہوئی"

اس قسم کی تحریر کسی معنے میں بھی تاریخی حیثیت میں شمار نہیں کیجا سکتی اور نہ ہی کسی اور مضمون میں ایسی تحریرات برداشت کی جا سکتی ہیں۔ جو عقیدت کہ ملکہ معظمہ کے متعلق ہندوستانی قلوب کے اندر موجود تھی۔ اس کی بنا پر پہلے سے ہی یہ قیاس کر لیا گیا تھا کہ مشرق میں ان کی رعایا ان خطوط کو نہایت دلچسپی سے پڑھیگی۔ حالانکہ یہی وجہ مصنّف کو مجرموں کے کٹہرہ میں کھڑا کر دیتی ہے کیونکہ ان خطوط کو ترتیب دیتے وقت اس نے ایک ایڈیٹر کے ابتدائی فرائض سے غفلت کا اظہار کیا ہے۔ یعنی مضمون زیر بحث میں خواہ مخواہ اپنی رائے کو ٹھونسنے سے دریغ نہیں کیا۔

میں اس امر کو تو فراموش نہیں کرتا کہ ہماری طرف سے بیرحمی اور سنگدلی کے واقعات ایک حد تک باغیوں کی اشتعال انگیز حرکات کا نتیجہ تھے۔ چنانچہ اپنی نسل اور قومیت پر فخر کرنے والے انگریزوں کے لئے صرف یہی ایک وجہ ایسی ہو سکتی ہے جس کی بنا پر وہ دنیا کے سامنے اپنے مذموم افعال کی حمایت میں کسی قدر گنجائش کا سامان دیکھتے ہیں۔ لیکن ایک معزز ہندوستانی مؤرخ کے قول کے مطابق جسکا ذکر پہلے بھی کیا جا چکا ہے کہ:-

"بے کس اور معصوم عورتوں اور بچوں کے سفاکانہ قتل و غارت سے ہندوستانی سپاہیوں نے اپنے اعلیٰ مقصد کو ذلیل اور بدنام کر دیا۔"

متذکرہ صدر تحریرات سے نمایاں طور پر پتہ چلتا ہے کہ ہندوستانی مظالم کے خلاف قرار واقعی مذمت کا اظہار کیا جا چکا ہے۔ لیکن اس سے بھی کہیں بڑھ کر زیادہ مذمت ہو سکتی تھی۔ بشرطیکہ ہم نے غدر کے حالات کی اشاعت میں دیانت اور انصاف سے کام لیا ہوتا۔ غدر کے ابتدائی قتل و خونریزی کی محرک میرٹھ چھاؤنی کی وہ چھوٹی سی جماعت تھی جو اس سزا سے برافروختہ ہو گئی تھی جو نہایت ہی ذلیل اور متشفانہ طریق سے روا رکھی گئی تھی۔ نیز اس یقین سے بھی کہ انگریزوں کا مقصد ہمارے تمدن اور مذہب کو نیست و نابود کرنا ہے اُن کے دماغوں پر ایک قسم کے جنون کی کیفیت طاری تھی۔ چنانچہ دہلی میں قتل و غارت کا جو بازار اس کے بعد گرم کیا گیا، اُس کی تہ میں بھی اسی مغلوب الغضب جماعت کا ہاتھ ہے۔ پھر تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد متعدد مقامات پر بے چینی بڑھتی گئی اور سپاہیوں نے بغاوت میں شریک ہونا شروع کر دیا۔ یہانتک کہ اکیس (۲۱) چھاؤنیاں بغاوت کی نظر ہو گئیں۔ اور دونوں طرف سے ایک عالمگیر بے چینی اور قتل و غارت کی کیفیت نمودار ہو گئی۔ لیکن کانپور اور جھانسی کے خونی واقعات

اُس وقت رونما ہوئے جب ہم نے نہایت بے رحمانہ طریق سے انتقام لینے کی کارروائی پر سختی سے عمل کیا اور متواتر بیدریغ انسانوں کو موت کے گھاٹ اُتار کر اُن کے دیہات اور فصلوں کو جلا کر خاکستر بنا دیا۔ چنانچہ یہ یقینی امر ہے کہ مورخین جنرل نیل NEILL کو کبھی اُن ہولناک مظالم سے بری الذمہ قرار نہیں دیں گے جن کی بنا پر کانپور کا خونی حادثہ رُونما ہوا جس کا بدلہ اس نے دل کھولکر سفاکی اور بربریت سے لیا۔

گو ہمارے مورخین نہایت وثوق سے یہ لکھتے رہے ہیں کہ غدر انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کیلئے شروع نہیں کی گئی تھی۔ بلکہ یہ محض ایک فوجی بغاوت تھی۔ پھر ہم نے مفروضہ قانون کے مطابق یا اُس سے بھی بالکل بے نیاز ہوکر بیدریغ انسانوں کو موت کے گھاٹ اُتارا اور دوستوں اور دشمنوں کے دیہات جلانے میں کوئی تمیز روا نہ رکھی۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ یہی فوجی بغاوت عام ہندوستانی آبادی کی ایک وسیع بغاوت ہو جاتی۔ پھر بھی ان مظالم کے باوجود اگرچہ آکسفورڈ تاریخ ہند کے مصنف کے قول کے مطابق، آگرے کا صوبہ" ہڑبونگ اور بغاوت کا سمندر" بن گیا تھا۔ لیکن سول رعایا نے مجموعی طور پر اپنے جذبات پر پورا قابو رکھا اور قوموں کی باہمی نفرت سے بالکل پاک رہی یقیناً اُن کا یہ طرز عمل ہر قسم کی ستائش اور تعریف کا مستحق ہے۔ کہ

انہوں نے بہت سے بے پناہ انگریزوں کی حفاظت کی۔ یہانتک کہ باغیوں یا گورنمنٹ ہند کی طرف سے مختلف قسم کی مالی ترغیب اور لالچ کے باوجود اپنے اس رویہ پر ثابت قدم رہی۔

"دس دن کے اندر اندر تمام اودھ سے انگریزی حکومت اس طرح غائب ہوئی کہ ڈھونڈنے سے بھی اُس کا کہیں سراغ نہیں ملتا تھا۔ فوجوں نے بغاوت کا اعلان کردیا اور لوگوں نے بھی اپنے آپ کو آزاد سمجھ کر ہم سے مُنہ موڑ لیا۔ لیکن اس تمام عرصہ میں نہ کوئی منتقمانہ کارروائی عمل میں لائی گئی اور نہ ہی کہیں کسی پر ظلم کیا گیا۔ چنانچہ اودھ کے بہادر اور سرکش باشندوں نے سوائے چند مستثنیات کے عام طور پر پناہگزین انگریزوں کو نہایت مہربانی اور شفقت سے اپنے ہاں پناہ دی۔ بالخصوص اودھ کے تعلقہ داروں نے تو نہایت فیاضی اور فراخ حوصلگی سے اپنے مفتوح آقاؤں کے ساتھ ہمدردی کا سلوک کیا۔ حالانکہ اس سے پیشتر انگریزوں کے ہاتھوں سے انہیں متعدد نقصانات اٹھانے پڑتے تھے۔ اور کئی قسم کی ناانصافیوں کے شکار رہ چکے تھے"[1]

ہم اس امر کو تو تسلیم کرتے ہیں کہ فریقین غلط اور بے بنیاد افواہوں سے برافروختہ ہو کر تقریباً دیوانہ ہو چکے تھے۔ چنانچہ بہت سے باغیوں نے یہ یقین کرلیا تھا کہ انگریزوں کا منشا ہندوؤں اور مسلمانوں کو

---

[1] Forest, I, P. 227.

ہندوستان سے نیست و نابود کرنے کا ہے۔ یا یہ کہ ہم جبراً اُن کے مذاہب کو ملیا میٹ کرنا چاہتے ہیں۔ علاوہ ازیں ہماری اپنی تواریخ کے مطالعہ سے بھی پتہ چلتا ہے کہ ملک میں ہمارے متعلق ایسے مکروہ اور شیطانی مظالم کے افسانے مشہور ہو گئے تھے۔ جن کا ہم خواب میں بھی تصور نہیں کر سکتے۔ پھر بھی بدقسمتی سے اُن پر یقین کر لیا گیا تھا۔ لوگ عام طور پر ایسی افواہوں پر بہت جلد یقین کر لیا کرتے ہیں۔ سوائے اس صورت کے کہ انہیں ایسے موقع پر انتظار کرنے اور سوچنے کی تربیت دی گئی ہو۔ جوش ایک ایسی آسان شاہراہ ہے جس پر پراپیگنڈا کا اثر نہایت تیزی سے ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جرمن پبلک نے بھی بلجیم کے مفروضہ بیانات کو صحیح تسلیم کر لیا۔ جو ایک حد تک بعد کی ظالمانہ کارروائیوں کے ذمہ دار تھے۔ اسی طرح جنوبی افریقہ کے جنگ کے سلسلے میں یورپ نے بھی ہمارے خلاف نہایت مکروہ زیادتیوں کو درست سمجھا تھا۔ جب کبھی دو فریق میں جنگ ہو جاتی ہے تو دونوں طرف سے ایک دوسرے کے خلاف متشددانہ مظالم کے الزامات لگائے جاتے ہیں۔ اور اس طرح نہایت آسانی سے ایک دوسرے کو ظالم اور مجرم مشہور کرنے کے لئے اعتماد اور یقین کی فضا پیدا کر لی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں عام لوگ تو امن کے زمانہ میں بھی متجسس اور راز جو نہیں ہوا کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ شہادت کی جانچ اور تحقیق کے مواقع

بہت ہی کم ہوا کرتے ہیں۔ اور خود ہماری اپنی رغبت بھی ایسی تحقیق و تفتیش کے لئے نسبتاً کم ہی ہوا کرتی ہے۔

(۱۰)

امرت سر کے واقع میں بھی اسی طرح یورپین قوم کے احساسات کو ٹھیس لگائی گئی۔ جو ایک حد تک حق بجانب بھی تھے۔ مردوں کے بیدردانہ قتل کے علاوہ ایک ایسی انگریز عورت پر بھی حملہ کیا گیا۔ جس نے اپنی زندگی ہندوستانی مستورات کی فلاح و بہبود کے لئے وقف کی ہوئی تھی۔ نیز ایسے اشتہارات چسپاں کئے گئے۔ جن میں انگریز عورتوں کو بے عزت کرنے کی ترغیب دی گئی تھی۔ بذاتہ یہ ایک ایسا مکروہ طرزِ عمل تھا جس سے انگریزوں کے غصے کا پارہ کھولاؤ کے درجہ تک پہنچ گیا۔ میرے نزدیک مفسدہ پرداز گروہ یا باغیوں کا جتھا۔ کیونکہ انہیں باغی کہنا زیادہ مناسب ہو گا۔ اس معاملہ میں تو کانپور کے خونی حادثہ سے بھی بڑھ کر ذلیل طرزِ عمل کے لئے تیار ہو گیا تھا۔ نیز اس مجمع میں تمام تر ذمہ داری اُن مجرمانہ ذہنیت کے انسانوں پر عائد ہوتی ہے۔ جن کی کثیر تعداد اُس وقت موجود تھی۔ لیکن میرا آج بھی یہ خیال ہے کہ اُس وقت کے حساس اور شریف ہندوستانیوں نے انگریزوں کے برافروختہ جذبات کا صحیح طور پر اندازہ کرنے میں نمایاں ناکامی کا ثبوت دیا ہے۔ کیونکہ وہ یہ نہیں سمجھ سکے کہ ہمارے نزدیک ایک مرد کو تکلیف پہنچانے

اور اذیت دینے سے طبیعت اس حد تک برافروختہ نہیں ہوتی جتنی کہ اُس وقت بے قابو ہو جاتی ہے۔ جب ہم یہ سنتے ہیں کہ کسی عورت کو بے عزت کیا گیا یا تکلیف دی گئی۔ بہت ممکن ہے کہ ہمارے یہ جذبات یا احساسات عام اخلاقیات کے ضابطے پر پُورے نہ اُتریں یا ممکن ہے کہ جیسا ہمیں اب آج بھی کہا جاتا ہے۔ کہ اس قسم کے جذبات کی نمائش محض بناوٹ اور منافقت ہے اور یہ ایک جھُوٹا طلسم ہے جو عورت کی عزت کے تحفظ کے نام پر بناوٹی رنگ میں، ایک ایسے زمانے میں پیش کیا جاتا ہے۔ جو درحقیقت وحشت اور بربریت کا مظہر ہے۔ اگرچہ دھوکے سے اُسے شجاعت اور بہادری کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ لیکن خواہ کتنی بھی کوشش کی جائے آپ ایک یورپین دماغ سے اس عقیدے کو نکالنے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے جو غلطی سے یا صحیح طور سے اُس نے اپنے اسلاف کی مبہم اور نیم روشن زندگیوں سے ورثہ میں حاصل کیا ہے یعنی اُس کا دعوےٰ ہے کہ محض اس جذبہ پر عمل کرنے سے اُس نے زندگی کو زیادہ شریف اور معزز بنانے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ بمقابلہ اُس جذبہ کے جس کا اظہار ہندوستانی مستورات اپنے خاوندوں کی چتا پر زندہ جلنے سے کیا کرتی ہیں۔ بہر حال اختلاف یا فرق بالکل ظاہر طور پر موجود ہے اور مناسب یہی ہے کہ اس سے احتراز ہی کیا جائے۔

پنجاب کے مظالم اور بالخصوص جلیانوالہ باغ کے خونی حادثہ کو حق بجانب قرار دینے کیلئے جس دیوانگی کے ساتھ یورپین قوم نے حمایت کا اظہار کیا۔ اس سے ایسا شدید نقصان پہنچا ہے کہ اس کا اندازہ کرنا ناممکن ہے۔ اس جوش کی کیفیت اسقدر عام نہیں تھی جتنی کہ ہندوستانی سمجھتے تھے۔ کیونکہ میں نے خود کئی ایک انگریز فوجی افسران کے منہ سے جلیانوالہ باغ کے متعلق نہائیت منصفانہ اور معتدل الفاظ سنے ہیں۔ یہانتک کہ پنجاب کو چھوڑ کر تمام سرکاری افسران کا رجحان بھی اس واقعہ کے خلاف تھا۔ مگر نوکری کی وجہ سے اُن کی زبانیں مقفل تھیں اور علانیہ اظہار خیال سے اپنے آپ کو مجبور محسوس کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس قسم کی ہمدردو آواز سے ہندوستانی کان نا آشنا رہے۔

انگریزوں کے لیئے اکثر یہ مفید ہوتا ہے اگر یہ مشرقی ممالک میں بجائے اپنے ہم قوموں سے علیحدہ بودوباش اختیار کرنے کے دیسی باشندوں کے درمیان رہائش بنائیں۔ جس سے بیگانگت بہت حد تک دُور ہو جاتی ہے۔ غدر میں انگریزوں کی بکھری ہوئی جماعتوں نے اپنی اپنی جگہ نہائیت غیر معمولی جرأت اور دلیری کا اظہار کیا۔ جن کو فراموش کرنے سے ہم اپنے آپ کو اور زیادہ کمزور کردیں گے۔ حالانکہ اُن کے مقابلہ میں کلکتہ اور شملہ میں آباد انگریزوں نے جہاں کہ فوجوں کے مسلسل پہنچنے کی وجہ سے گھر سے زیادہ امن و آرام نصیب تھا پھر

بھی انہوں نے خطرات میں گھرے ہوئے انسانوں کی طرح دیوانہ وار ظلم اور تشدد کی پالیسی پر عمل کرنے کا شدت سے مطالبہ کرنا شروع کردیا۔ چنانچہ لارڈ کیننگ Canning ملکہ معظمہ کو اپنی ایک چٹھی میں اس کیفیت کا اس طرح اظہار کرتا ہے کہ:۔

"کسی آدمی کا یہ حق نہیں ہے کہ اُن افراد کی چیخ و پکار یا ہندوستانیوں کے خلاف نفرت و حقارت کے اظہار پر کسی قسم کی حرف گیری کر سکے۔ جن کے عزیز نہائت سفاکی اور بیدردی سے باغیوں کے ہاتھوں قتل کئے گئے ہیں۔ لیکن تعجب تو یہ ہے کہ یہ آواز ایسی جماعت کی طرف سے بلند ہو رہی ہے۔ جو شروع سے لیکر آخر تک نہائت اطمینان کے ساتھ اپنے گھروں میں آرام و آرائش سے بیٹھی رہی۔ جن کے قلوب اُن صعوبتوں اور سختیوں سے محض ناآشنا ہیں۔ جو دوسرے بدنصیب انسانوں کو اُٹھانی پڑیں۔ بنا بریں مجھے اندیشہ ہے کہ اس قسم کی دیوانگی ہندوستان میں امن اور حُسنِ انتظام کی بحالی کے لئے سخت رکاوٹ ثابت ہوگی۔ خواہ تمام باغیوں کو قرار واقعی سزائیں ہی کیوں نہ دیدی جائیں" [1]

لارڈ کیننگ کی پیشگوئی حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی۔ چنانچہ اس چٹھی میں وہ آگے چلکر لکھتا ہے کہ:۔

"حضور والا کو یہ تحریر کرتے ہوئے لارڈ کیننگ Canning کو سخت

---

[1] Letters of Queen Victoria, iii, 251.

صدمہ ہوتا ہے کہ ہمارے راستہ میں سب سے زیادہ رکاوٹ انگریزی قوم کا وہ بغض و عناد ہے جس کا اظہار وہ نہایت متشددانہ طریق سے ہر ہندوستانی کے خلاف کر رہی ہے اور نہ ہی ایسے افراد کی سمجھ میں یہ بات آتی ہے جو نہایت شدومد سے ہندوستانیوں کے خلاف بذریعہ تحریر و تقریر پراپیگنڈا کر رہے ہیں۔ کہ اگر ہم نے ہندوستان کو اپنی مملکت میں رکھنا ہے تو ہمیں لازماً ان پر اعتماد کرنا ہوگا۔ اور فوج اور سول محکمہ جات میں ان کو ملازم رکھنے کے بغیر چارہ نہیں میرے اس خیال میں یقیناً مبالغہ آرائی کا پہلو نہیں نکلتا۔ کہ اگر آج ملکہ معظمہ کی طرف سے یہ اعلان کر دیا جائے کہ آئندہ سے کسی ہندو یا مسلمان کو گورنمنٹ کے کسی شعبے میں ذمہ داری کے کسی عہدہ پر متعین نہیں کیا جائیگا۔ سوائے اس کے کہ صرف چپڑاسیوں یا معمولی محرروں کا کام لیا جائیگا۔ تو حضور یقین کریں کہ انگریز قوم خوشی کے شادیانے بجائیگی۔ کیونکہ ان کی یہی خواہش ہے کہ انگریزوں اور دیسی رعایا کے درمیان نفرت اور عدم اعتماد کی ایک خلیج حائل ہو جائے۔ بلکہ بعض انگریزوں کا تو اس وقت یہ عقیدہ بن گیا ہے کہ کوئی ہندوستانی کسی وقت بھی کسی انگریز کی ہمدردی اور وفاداری کا ثبوت نہیں دے سکتا۔ حالانکہ موجودہ نازک دور میں بھی ہندوؤں اور مسلمانوں کی فیاضی اور وفاداری کی بیشتر مثالیں ریکارڈ پر آچکی ہیں پنجاب کے حوادث کے بعد سب سے زیادہ شور مچانے والے وہ لوگ نہیں

تھے جو اپنے کاروبار یا نوکری یا مذہبی تبلیغ کی بنا پر ہندوستان کے درمیان زندگی بسر کرتے تھے۔ بلکہ یہ وہ جماعت تھی جو اگرچہ گنجان آبادیوں میں پولیس اور فوج کی محافظت میں نہایت امن اور راحت کے ساتھ زندگی بسر کرتی تھی۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی دوسرے غدر کے موہوم خطرے نے اُن کے ہوش وحواس پر اس طرح قبضہ کر لیا ہے کہ وہ طاقت رکھتے ہوئے بھی اپنے آپ کو بالکل کمزور اور محصور سمجھتے ہیں۔ برخلاف اس کے ایک ضلع کا حاکم یا چائے کے کھیت کا مالک اگرچہ وہ ہندوستانیوں میں گھرا ہوا رہتا ہے مگر اپنے آپ کو کمزور محسوس نہیں کرتا۔ اور اپنے تدبر اور تجربہ کی بنا پر، نیز اپنے ذاتی تعلقات کے بھروسے پر، اس حد تک خود اعتمادی پیدا کر لیتا ہے کہ وہ ایسے معاملات میں ضبط اور تدبر کو کبھی ہاتھ سے نہیں دیتا۔

ہماری مستورات کے لئے یہ ملک مناسب نہیں بلکہ روز بروز مخدوش ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ایک عورت کے لئے یہاں کی زندگی اسی صورت میں قابلِ برداشت ہو سکتی ہے۔ اگر اس کا خاوند روزانہ زندگی کی آسائش اور ضروریات کو اپنی تنخواہ سے پورا کرنے کے قابل ہو کیونکہ ضروریاتِ زندگی دن بدن گراں ہو رہے ہیں۔ ایک انگریز عورت اپنی ذاتی نسوانی خوبیوں کے علاوہ تھوڑی سی نسوانی آزادی کی بنا پر جو ہندوستانی مستورات کو نصیب نہیں۔ ہندوستانیوں سے عام طور پر اپنے لئے ایک قسم کی پرستش حاصل کرنے میں کامیاب رہتی ہے۔ خواہ اس کا

خاوند ضلع کا حاکم ہو یا پادری، یا زمیندار لیکن انگریز عورتیں اکثر چڑچڑی مزاج کی ہو جاتی ہیں۔ اور ہندوستانیوں کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھنا شروع کر دیتی ہیں۔ چنانچہ پنجاب کے حوادث میں سب سے زیادہ نمایاں طور پر جس چیز کو ہندوستانیوں نے بالعموم اور ہندوستانی مستورات نے بالخصوص محسوس کیا۔ وہ ہماری مستورات کا طرزِ عمل تھا جس کا اظہار انہوں نے جلیانوالہ باغ کے حادثہ کی پُرزور حمایت میں کیا تھا۔ کیونکہ تقریباً ہر ہندوستانی عورت کے کان اس حادثہ کی جملہ سرگزشت سے بخوبی آشنا تھے۔ اور وہ پوری طرح سے متاثر ہو چکی تھی۔ چنانچہ ذیل کا واقعہ اس معاملہ پر کافی روشنی ڈالتا ہے:۔

سوال:۔ "تمہیں کس وقت علم ہوا کہ تمہارا خاوند باغ میں قتل کر دیا گیا؟"

جواب:۔ "گولی چلنے کے کچھ عرصہ بعد میں نے اپنے بازار میں سنا۔ کہ ہزاروں آدمی قتل کیے گئے ہیں۔ یہ سن کر میں پریشان ہو گئی اور دل میں یہ ارادہ کیا کہ فی الفور باغ میں پہنچنا چاہیے۔ چنانچہ دو ہمسایہ عورتوں کو ساتھ لیکر وہاں پہنچی۔ جہاں پر تمام جگہ کو مُردہ لاشوں سے بھرا ہوا پایا اور میں نے اپنے مقتول خاوند کی لاش کو ان میں ڈھونڈھنا شروع کیا۔ چنانچہ لاشوں کے انبار کے نیچے سے میں نے اپنے خاوند کی لاش کو کھینچ کر باہر نکالا اور تمام جگہ خون کا تالاب نظر آتی تھی۔"

اس کے بعد گواہ نے بتایا کہ اس نے خاوند کی لاش کو گھر پہنچانے

کیلئے امداد کی تلاش کی لیکن ناکام رہی۔ چنانچہ وہ بیان کرتی ہے کہ میں مایوس ہو کر واپس آگئی۔ اور اپنے خاوند کی لاش کے پاس بیٹھ کر اسی طرح تمام رات گذار دی۔ جہاں پر کتوں کی کثرت کی وجہ سے مجھے اکثر چھڑی کو استعمال کرنا پڑتا تھا۔ رات کے دو بجے ایک سکھ زخمی کے کراہنے کی آواز سن کر اس کے پاس گئی اور اس کی ٹانگ کو درست طریق پر رکھ دیا۔ جس سے کسی قدر اُس غریب کو افاقہ ہو گیا۔ وہاں پر ایک بارہ سال کا زخمی بچہ بھی تھا۔ جو تمام شب روتا رہا۔ اور بار بار مجھ سے یہی التجا کرتا رہا کہ میں اُس کے پاس بیٹھی رہوں۔ کیونکہ اُس حالت میں تاریکی میں وہ ڈر محسوس کرتا تھا۔ پاس ہی ایک اور زخمی تھا جو نہائیت ہی دردناک طریقے سے تمام رات پانی کے لئے التجائیں کرتا رہا۔ میں نے ہر چند پانی مہیا کرنے کے لئے کوشش کی لیکن افسوس کہ ناکام رہی۔ تمام رات زخمیوں کی دردناک چیخیں سنتی رہی یا کتوں کے بھونکنے اور گدھوں کے ہنہنانے کی مکروہ اور بھیانک آوازیں آتی رہیں۔ علی الصبح چھ بجے کے قریب سُندر داس چارپائی لے کر پہنچا جس پر مقتول خاوند کی لاش کو ڈال کر ہم لوگ گھر پہنچے۔ جہاں پر کچھ عرصہ ٹھیرنے کے بعد شمشان بھومی میں لیجا کر لاش کو آگ دیدی گئی[1]

خوش قسمتی سے ہندوستان میں ایسے ہندوستانی موجود ہیں جو یہ محسوس کرتے ہیں کہ بہ حیثیت ایک قوم کے ہمارا طرزِ عمل نہایت مکروہ رہا ہے۔

---

[1] O, Dywer v. Nair, Times report, 28th May 1924.

لیکن جس وقت ایسے واقعات کی تلخ یاد سے وُہ کبیدہ خاطر ہوتے ہیں، تو صرف انگلستان کی فیاضی اور برتری کی بعض خوشگوار مثالوں کی یاد ہی ایسے مذموم واقعات کی تلخی کو کسی قدر کم کرنے میں کامیاب ہوا کرتی ہے۔ ورنہ ممکن ہے کہ ایسے رنجدہ واقعات ابھی اور سُننے میں آتے۔

(۱۲)

غدر کے ہنگامے میں جس جماعت نے سب سے زیادہ نقصان اُٹھایا وُہ مخلوط النسل انگریزوں (EURASIANS) یعنی دوغلوں یا کرسٹانوں کی جماعت ہے اس جماعت پر ہم نے خود بھی بیحد ظلم کئے ہیں یعنی مسلسل شرمناک اور مکروہ طریقوں سے تغافل کی پالیسی پر عمل کرکے ہم نے اس جماعت کو نہایت ہی کمزور اور ماتحت حیثیت میں رکھ چھوڑا ہے جس سے لازمی طور پر طبائع میں تلخی پیدا ہو جاتی ہے اور دماغ میں موجودہ بدبختی کا احساس ہر وقت موجود رہتا ہے۔ اگرچہ موجودہ بُعد اور دُوری کا نتیجہ تو یہ ہونا چاہیئے تھا کہ ایک وسیع خلیج پیدا ہو جاتی لیکن اس کے برخلاف دونوں اقوام ایک دوسرے کیخلاف شدت سے برافروختہ ہوگئیں۔ گذشتہ دَور میں اس قوم نے برٹش راج کی زرّیں خدمات انجام دی ہیں۔ چنانچہ تاریخ ہند کے صفحات کئی ایک معزز افراد کے بےنظیر استقلال اور دماغی قابلیت کے کارناموں سے آفتاب کی طرح چمکتے ہیں۔ اسی طرح ہندوستانی قوم کے دل میں بھی انگریزوں کی طرح دوغلوں (EURASIANS) کیخلاف ویسی ہی شدید نفرت موجود ہے اور دوسری طرف ہندوستانی خون کی آمیزش کے موانع کے بنا پر انگریزوں کے ہاتھوں نہایت ہی غیر منصفانہ اور ظالمانہ طریق سے ان

کے ساتھ سلوک کیا جاتا ہے جو بیحد حوصلہ شکن ہے مگر اس کے باوجود یہ قوم یہی محسوس کرتی ہے کہ اپنی آئندہ بقا اور ترقی کیلئے انگریز کے دامن میں پناہ ہے۔ چنانچہ اپنی کمزور آواز اور بھونڈے طریق سے اس مقصد کی تکمیل میں برابر سرگرم نظر آتی ہے اور ایسی بے نظیر وفاداری کا اظہار کرتی ہے جس کی مثال سلطنت کی دیگر نوآبادیات کی اقوام میں عنقا ہے ہم حیران ہیں کہ ہماری طرف سے انتہائی ناروا سلوک کے باوجود وہ ہم سے ایسی اندھی وفاداری کا اظہار کیوں کرتی ہے۔ چنانچہ گذشتہ یورپ میں ایسی عدیم المثال جرأت اور بہادری کا ثبوت اس قوم نے پیش کیا ہے جس سے وہ بجا طور پر کسی انگریز سے شانہ بشانہ کھڑے ہوکر مساوی حیثیت کی حقدار کہلائی جا سکتی ہے۔ اگر ہماری سلطنت جو اسلحہ جنگ اور خود غرضانہ نشر و اشاعت پر بیدریغ روپیہ صرف کرنے کی عادی ہے۔ تھوڑی سی رقم بھی اس گری ہوئی قوم کی تعلیم و تربیت پر صرف کرے تو اس سے نہ صرف بیحد تقویت پہنچ سکتی ہے۔ بلکہ کشیدگی کی خلیج میں بھی نمایاں کمی واقع ہو سکتی ہے۔ اور اس سے ہمارے اور ہندوستانی دماغوں سے بے اعتمادی کے سیاہ بادل بہت حد تک معدوم ہو جائیں گے۔

(۱۳)

ہمیں غدر کے اثرات کو جو دو صدیوں کی مسلسل غلط بیانی سے تاریک ہو چکے ہیں۔ پورے تدبر اور غور سے دور کرنے کی کوشش

کرنی چاہیئے۔ ہمیں مکمل وضاحت کے ساتھ اس پالیسی کو تبدیل کرنا چاہیئے کہ ہماری سلطنت سے مراد ہندوستان میں آقاؤں کی غلاموں پر حکومت کرنی ہے۔ اور معاملات کے حل کرنے میں چونکہ ہم ایک بردہ فروش آقا کی طرح اپنے ہموطنوں کی خوبیوں کا اندازہ لگایا کرتے ہیں یا جیسے ایک شکاری شکار کے وقت کتوں کی خدمات اور اوصاف کو پرکھتا ہے۔ قطع نظر اس بات کے کہ ایک وقت میں ہندوستانیوں نے کارتوسوں کے جبریہ استعمال اور ہمارے اصرار پر ہم سے بغاوت کی۔ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہندوستانی ہمارے ساتھ وفادار ہیں اور نمک حرامی تو نہیں کرتے؟ حالات خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہوں اور خواہ کیسی ہی مفروضہ شکایات کی بنا پر ناقابل یقین حماقت سے ہمارے خلاف اقدام ہی کیوں نہ کیا گیا ہو۔ پھر بھی دیکھنا یہ ہے کہ کیا من حیث القوم ہندوستانی ہمارے وفادار ہیں یا نہیں۔ ایک عیسائی مشن کے نمائندے سے دوران گفتگو میں جبکہ وہ مسٹر رابندر ناتھ ٹیگور کی علمی قابلیت کا اظہار کر رہا تھا۔ میرے ایک دوست نے معاً یہی سوال پیدا کیا کہ وہ ہمارا وفادار ہے؟ کیونکہ اس کے نزدیک دلچسپی کا پہلو صرف اسی سوال میں مضمر تھا۔ سوال کنندہ نہایت ہی بے دماغ شخص تھا۔ اگرچہ اس نے اس سوال کو پیش کرتے وقت اپنے آپکو ایک عقیل و مہذب قوم کے نمائندہ کی حیثیت میں ظاہر کیا جو ایک ایشیائی سے عام طور پر

اندھا دھند تقلید اور اطاعت کی خوگر ہُوا کرتی ہے۔ یہانتک کہ اگر اُس کا مخاطب سینٹ پال جیسی عظیم شخصیت کا مالک بھی ہوتا تو پھر بھی وُہ اُس سے یہی سوال کرتا۔ اِس کے مقابلہ میں آسٹریلیا یا کینیڈا کے کسی باشندے کے متعلق ایسا شبہ کرنے کا خیال بھی اس کے ذہن میں کبھی نہیں آئیگا۔ ہندوستانی علی الاعلان ہم سے آج یہ سوال کرتے ہیں کہ کیا ہم نے کبھی اُن کو شہریت کے وہ حقوق عطا کئے ہیں جو صحیح معنوں میں ایک شہری کا زیور ہوتے ہیں۔ پنجاب کے حوادث میں شہروں پر بمب گرانے کے مظالم نے بھی اس حد تک نفرت اور ذلّت کے احساسات کو پیدا نہیں کیا۔ جس حد تک کہ پیٹ کے بَل رینگنے کے انسانیت سوز حکم نے برانگیختہ کیا ہمارے خلاف اظہار رائے کرتے ہوئے ہندوستانیوں نے علانیہ یہ دلیل پیش کی کہ یہ بات تو ذہن میں آسکتی ہے۔ کہ حکومت گلاسگو یا لورپول میں عام لوگوں پر بازاروں میں گولی چلانے کا حکم دیدے۔ لیکن یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ جبتک لوگوں کی طرف سے کھُلی جنگ کا اعلان نہ کردیا جائے۔ وہ ہوائی جہازوں سے ان پر بمب گرانے کا حکم دیدے۔

ایسے تمام انگریزی مردوں اور عورتوں کی خدمت میں جو اپنے خیال اور عمل میں انصاف کو ہاتھ سے دینا نہیں چاہتے۔ بہ ادب گذارش کروں گا۔ کہ جو کچھ کیا جا چکا ہے وہ کسی طرح

بھی مناسب نہیں تھا۔ ہمارے ہمعصر ہندوستانیوں میں غلامانہ اظہار عقیدت کے علاوہ جسے ہم اپنی اصطلاح میں "وفاداری" سے موسوم کرتے ہیں اور بھی ایسی کئی خوبیاں ہیں۔ جو ہم سے بدرجہا زیادہ افضل اور ہماری خودداری کے مفہوم سے بھی کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر ہیں لیکن اِن تمام اوصاف کے باوجود اگر پھر بھی ہم ہندوستانیوں کو بغاوت اور غدر کی میگزین کے شعلوں کو بھڑکانے والے فتیلے ہی سمجھتے رہیں۔ یا ان میں سے ہر ایک کو ہم اُسی خونی جماعت کے شریکِ کار کی حیثیت سے دیکھیں جن کے ہاتھ کانپور کے حادثہ سے رنگے ہوئے ہیں تو اس تمام بداعتمادی کے جواب میں وہ صرف ایک ہی خوبی کا اظہار کر سکتے ہیں۔ کہ وہ اپنے طرزِ عمل کو ہمیشہ اس حد تک مخدوش بنادیں کہ ہم ہر ہندوستانی کے متعلق اسی شبہ کا اظہار کرتے رہیں کہ کیا وہ ہمارے ساتھ وفادار ہے۔ یعنی باہمی اعتماد بالکل جاتا رہے۔

(۱۴)

غدر کے بعد ہندوستانیوں کے دماغ پر اس رنجدہ حادثہ نے کیا اثر چھوڑا۔ اس وقت میں اس پر بحث کرنی نہیں چاہتا کیونکہ قارئین خود ہی اس کا اندازہ کافی طور پر کر سکتے ہیں یہ قاعدہ ہے کہ جب دو قومیں آپس میں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہوا کرتی ہیں تو میدانِ جنگ میں طرفین سے جس قدر خونریزی اور قتل کی واردات

عمل میں آتی ہیں ۔ وہ بعد میں ایک دوسرے کو معاف کی جاتی ہیں۔ لیکن جس وقت ایک فریق اپنے آپ کو ایک مفروضہ عدالت کی شکل میں تبدیل کر کے دوسرے کیلئے بیدریغ پھانسیوں اور قتل و غارت کو پسند کر لیتا ہے تو اس کا یہ فعل اس حد تک مذموم قرار دیا جاتا ہے ۔ کہ جبتک مظلوم قوم کی نسل زندہ رہتی ہے ۔ وہ نہ تو مظالم کی بنا پر فاتح کو معاف کر سکتی ہے اور نہ ہی فراموش کیا کرتی ہے۔ چنانچہ باوجود اس امر کے کہ صرف بارہ سال پہلے ہزاروں کی تعداد میں سکھ ہمارے ہاتھوں سے میدانِ جنگ میں کام آئے تھے ۔ مگر غدر کے موقعہ پر وہ ہمارے ساتھ حلیف کی حیثیت سے برابر شریک رہے ۔ لیکن دوسری طرف جب مسٹر کووِن (COWEN) نے سنگدلی سے پچاس سکھوں کو مالیر کوٹلہ میں توپوں سے باندھ کر اڑا دیا تو اس واقعہ کا یہ اثر ہوا کہ اس وقت سے لیکر آج تک اُن کے اور ہمارے درمیان اختلاف اور دشمنی کی ایک وسیع خلیج پیدا ہو گئی ہے ۔ غدر کے خونی ڈرامہ میں ناتھن ہیل Nathan Hale میجر انڈرے Major Andre وولف ٹون Wolf Tone اور پیرس Pearse جیسے افسران کا نام اُن کے مظالم کی وجہ سے آج تک زندہ ہے ۔ مزید براں جب ایسے مظالم کو افسران کی رپورٹوں میں بھی جگہ نہ دی ۔ اور نہ ہی غدر کے متعلقہ حالات میں ان حوادث کی صحت کو تسلیم کیا گیا ۔ تو

اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ اِن مظالم کی یاد نسلاً بعد نسلاً شمالی ہند کے بازاروں میں افسانوں کے رنگ میں آج تک زندہ چلی آتی ہے۔ چنانچہ یہ کوئی ناممکن بات نہیں ہے کہ "پنڈت جی" (ہمہ وصفہ ہندی سیاست دان) اس دبی ہوئی تلخی کی آگ کو آج بھی کُرید کُرید کر بھڑکانے میں کامیاب نظر آتا ہے۔ کیا ہندوستان میں اب بھی ایسے خاندان یا ہمدرد یا اُن کے ورثاء موجود نہیں ہیں جن کو ہم نے مفروضہ عدالتوں کے حکم سے یا ویسے ہی بغیر کسی قسم کے مقدمہ چلانے کے صرف اپنی مرضی سے "بیدریغ پھانسیوں پر نہیں لٹکایا تھا۔ چنانچہ ہندوستان کے مشہور قوم پرست لیڈر مسٹر تلک آنجہانی کے ایک رشتہ دار نے اس کا نقشہ ذیل کے الفاظ میں قلمبند کیا ہے:۔

"خاندان کا بزرگ اپنے اسلاف کی طرح اگرچہ مذہبی مراسم کی ادائیگی میں بیحد متعصب اور مضبوط ہوتا تھا۔ جو دیوانگی کی حد تک پہنچی ہوئی تھی لیکن ۱۸۵۷ء کے غدر میں جب اس کا خسر پھانسی پر لٹکا دیا گیا تو اُس وقت سے لیکر آج تک اُسکے مزاج میں اس واقعہ کی یاد سے تُرشروئی اور تُندخوئی کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ یہاں تک کہ بعض اوقات تو وہ دیوانگی کی شکل اختیار کر لیتی تھی۔"[۱]

"فریبی اور چالاک مشرقی دماغ کو سمجھنا غالباً بہت مشکل امر ہے

---

۱ Tilak, By Winslaw (oxford)

کیونکہ کوئی شخص دعویٰ سے نہیں کہہ سکتا کہ کونسی چیز اس وقت اُس کے دماغ میں پنہاں ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ عام ہندی دماغ میں غدر کے واقعات کی تلخ یاد ہر وقت موجود رہتی ہے چنانچہ ایک انگریز پادری نے راقم تحریر کو بتایا کہ شروع شروع میں جب میں ہندوستانی طبائع سے ناواقف تھا تو ایک دفعہ میں نے عیسائی مبلغین کی جماعت کو یہ حکم دیا کہ وہ غدر پر ایک جواب مضمون لکھیں۔ لیکن ہر ایک طالبعلم نے بغیر کچھ لکھنے کے خالی کاغذ مجھے واپس کر دیئے یعنی اس کام کو نہ کرنے کا ایک خاموش متفقہ اور ناقابلِ معافی انکار تھا۔[۱]

غدر کی اصلیت سے پورے طور پر واقف انگریزوں میں سے بعض کا یہ خیال ہے کہ ہمارے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ ہم کچھ سال اور انتظار کی پالیسی پر عمل کریں۔ یہانتک کہ وہ انسان ہی دنیا سے رحلت کر جائیں جن کے دماغوں میں غدر کی تلخ یاد کا ذخیرہ موجود ہے لیکن حالت یہ نہیں ہے کیونکہ جبتک ہماری منتشر کردہ غدر کی تواریخ دنیا میں موجود رہیں گی۔ اُس وقت تک ہمارے خلاف نفرت بڑھے گی اور پھیلتی رہے گی۔ یہی وجہ ہے کہ غدر کی تلخ یاد نے بیس سال پہلے جتنا احاطہ کیا ہوا تھا۔ آج اس سے کہیں زیادہ حصے تک سرایت کر چکی ہے۔ برٹش سیاست کو مدِنظر رکھتے

---

[۱] W. H. Fitchett, The Tale of the Great Mutiny p. 440/441

ہوئے تو ہم نے مسٹر گلیڈسٹون (Glad Stone) اور لارڈ سیلسبری (Lord Salisbary) جیسے مشہور زمانہ مدبّرین کے خیالات تک کو چھوڑ دیا ہے کیونکہ وقت کی ضرورت ان کے برخلاف حکم دیتی تھی۔ لیکن ہندوستان کے متعلق ہم ابھی تک اُسی فرسودہ پالیسی پر عمل کر رہے ہیں۔ یہاں تک کہ ہندوستانیوں میں نااتفاقی اور باہمی اختلاف کو زندہ رکھنا۔ قدیم سے ہمارے سیاست دانوں کا نہایت ہی مرغوب مشغلہ بنا ہوا ہے۔ لیکن ہندوستان اتفاق و اتحاد کی ضرورت کا بیش از بیش احساس نہایت تیزی سے کر رہا ہے۔ چنانچہ اودھ کو غدر کے زمانہ میں جن مصائب سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ آج اُن مصائب و تکالیف کی صدائے بازگشت اودھ سے باہر کے صوبوں میں بھی ہمدردی کے لہجے میں بلند ہو رہی ہے، یہاں تک کہ جنوبی ہند کی غیر آباد پہاڑیوں میں رہنے والے قدیم دراوڑ قوم کے افراد میں بھی، دہلی کے مظالم کی یاد سے تلخی کی آگ کی چنگاری ظاہر ہو رہی ہے۔ ایسی حالت میں اس دشمنی کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لئے دو ہی طریقے استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ اوّل یہ کہ تمام درسگاہوں اور کالجوں کو یکقلم بند کر دیا جائے اور لکھنے اور پڑھنے کی تمام کوششوں کو نہایت سخت قوانین سے روک دیا جائے اور جہاں تک ممکن ہو تعلیم کے تمام ذرائع اور بحث و خیال کے تمام دروازوں کو سختی سے بند کر دیا جائے۔ ورنہ دوسری صورت یہ ہے کہ واقعات

کی سچائی کو تسلیم کر کے غلط بیانی کے پچھلے طریقے کو خیرباد کہہ دیں۔
وہ ہندوستانی جو انگلستان میں جاتے ہیں اس تلخی کو زیادہ سختی سے محسوس کرتے ہیں۔ مسٹر ونایاک ساورکر (Vinayak Savarkar) - لنڈن میں ایک طالب علم کی حیثیت میں مقیم تھا۔ اور اگرچہ اس وقت وہ سر کرزن وائیلی (Sir Curzon Willie) کے قتل کی سازش میں شریک ہونے کی وجہ سے عمر قید کی سزا بھگت رہا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ باوجود اس شفقت آمیز سلوک کے جو انگلستان میں ہندوستانی طالبعلموں سے بالخصوص روا رکھا جاتا ہے جس کی تصدیق بھی بیشتر ہندوستانی حضرات نے اکثر کی ہے۔ وہ کیوں ہم سے اس درجہ متنفر ہو گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں پر اُس نے بیحد مطالعہ سے غدر کے واقعات پر ایک مبسوط کتاب لکھی جس کو ۱۸۵۷ء کی ہندوستانی آزادی کی جنگ کے نام سے موسوم کیا۔ چنانچہ سر ولینٹائن چرل (Sir Valentine Chirol) اس کتاب کے متعلق ذیل کے الفاظ میں اظہار رائے کرتا ہے:-

"غدر کے متعلق اپنے رنگ میں یہ ایک قابل غور تاریخ ہے جس میں اگرچہ واقعات کو نہایت محنت و تحقیق سے اکٹھا کیا گیا ہے۔ لیکن اُن کی ترتیب میں بعض واقعات کو بہت بڑی طرح اُلٹ پلٹ کر کے پیش کیا گیا ہے۔ مزید براں اعلی علمی

قابلیت کے اظہار کے باوجود اس کتاب میں انگریزوں کے برخلاف وحشیانہ نفرت بھی ٹپکتی ہے"[1]

ناظرین کو غالباً یاد ہوگا کہ جب اس کو ہندوستان میں مقدمہ کیلئے کھیجا گیا تھا۔ تو اُس نے راستے میں بھاگنے کی کوشش کی تھی۔ یعنی وہ جہاز سے سمندر میں کود پڑا اور تیر کر مارسیلز کی بندرگاہ میں جا اُترا۔ جہاں اُسے فرانسیسی حکام نے بڑی ردّ و قدح کے بعد انگریزوں کے حوالہ کر دیا کیونکہ انگریزوں نے اُس کی واپسی کا مطالبہ کرتے ہوئے اُسے ایک عام قاتل کی حیثیت میں شمار کیا تھا۔ نہ کہ ایک سیاسی مجرم کی حیثیت میں جس کی پاداش میں اُسے عمر قید کی سزا دی گئی۔ بہرکیف اُس کے جُرم کو کسی طرح کم سنگین خیال نہ کرتے ہوئے آج بھی ممکن ہے ایسے انگریز ملیں جو حکومت کے اس فعل پر اظہار افسوس کریں کہ اس نے ایک نوجوان کو جو نہ صرف اعلیٰ علمی قابلیت رکھتا تھا۔ بلکہ اُس کے ساتھ ہی پرلے درجہ کا نڈر اور دلیر بھی تھا۔ عمر قید کرکے ہمیشہ کے لئے ضائع کر دیا۔ نفرت و حقارت کی چمکتی ہوئی مشعل کی روشنی میں اس مستقل مزاج نوجوان نے ممنوعہ تاریخ کی ورق گردانی کرکے ہمارے اُن تمام افعال کو بصیرت کی نگاہ سے بے نقاب کر دیا۔ جن کے متعلق ہم یہ

---

[1] Indian Unrest, P. 149.

اُمید لگائے بیٹھے تھے کہ وُہ رازِ سربستہ کی طرح دُنیا کی آنکھوں سے ہمیشہ کے لئے اوجھل رہیں گے۔ چنانچہ دنیا کی سب سے زیادہ مکروہ اور ظالمانہ جنگ کے حالات جو ہماری اپنی خشک اور گستاخ قلم سے نکلی ہوئی سچائیوں کے مظہر تھے۔ جب اُس کی آنکھوں سے گزرے تو اُس کے دماغ پر ایک قسم کا جنون مسلط ہو گیا۔ جو بالآخر ایک قتل کی صورت میں ظاہر ہوا۔ جسے بعض مورّخین انگلستان میں مقیم ہندی طلبا کی ذہنیت کا صحیح نمونہ سے تعبیر کرتے ہیں۔

(۱۵)

میرے نزدیک یہ نہائت ہی مناسب ہے کہ گورنمنٹ نے ساورکر کی تاریخ کو بحقِ سرکار ضبط شدہ قرار دے دیا ہے۔ لیکن اگر ہماری یہ خواہش ہے کہ اس لڑائی کے بعض حالات پر پردہ ہی پڑا رہے تو ہمارے لئے یہ لازم ہے کہ ہم ہندوستانیوں کے نقطۂ نظر کو بھی اپنی تواریخ میں جگہ دیں۔ کیونکہ جہانتک موجودہ حالات کا تعلق ہے ہم نے ہندوستانیوں کے خلاف عام طور پر یہ مشہور کر دیا ہے کہ وُہ بیحد خونخوار اور انتہا درجے کی ناقابلِ اعتماد قوم ہے۔ حالانکہ یہ ایسی خوفناک تہمت ہے جو کسی معنے میں بھی اُن پر چسپاں نہیں ہو سکتی چنانچہ اس کا خاکہ ایک مورّخ اس طرح کھینچتا ہے کہ:۔

"مشکل ہی سے چند ایک ہندوستانی ایسے ظالم نکلیں گے۔ جیسے کہ عام طور پر کسی ظالم کو سمجھا جاتا ہے۔ خون اور مصائب کے دردناک نظارے سے ایک ہندوستانی نژاد ہندو یا مسلمان شاذ و نادر ہی خوش ہوا کرتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس میں مستثنیات بھی ہوتی ہیں کیونکہ مسلمان حکمرانوں میں سے بعض تو خاص طور پر خونخواری میں شہرۂ آفاق تھے۔ لیکن عام طور پر یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان میں ظلم کا دور دورہ غیر ملکی اقوام کے قبضے کے بعد اور خاص طور پر ترکوں کی حکمرانی میں شروع ہوا پھر بھی ہندوستانی باشندے ظالمانہ کارروائیوں میں خاص طور پر خوشی محسوس کیا کرتے ہیں۔" ؎

ہندوستانی تاریخ اور سیرت کو جس غلط طریق پر ہم نے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ اُس کا نتیجہ ہمارے حق میں اسقدر مہلک ہوا ہے کہ ہندوستانی اعتدال پسند جماعت نے بھی ہماری عطا کردہ اصلاحات کی سکیم کو کامیاب بنانے سے صاف انکار کر دیا ہے۔ حالانکہ وہ اس سلوک کی مستحق نہ تھی۔

دوسری طرف ہندوستانی بھی منتقمانہ طریق سے ہمارے خلاف غلط بیانی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ چنانچہ اُن کے کثیر الاشاعت

؎ The lost dominion, P. 91

ماہوار رسالوں کے مطالعہ سے مجھے تو یہی محسوس ہوتا ہے۔ کہ ضمیر کی آواز سے کلیتاً بے نیاز ہو کر غلط بیانی کی اشاعت کی جاتی ہے۔ حالانکہ نشر و اشاعت کے

اس مذموم طریق کی طرف اگر ہندوستانیوں کو متنبہ کیا جائے تو گو وہ اس کو تسلیم نہیں کریں گے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی جواباً کہہ اُٹھیں گے کہ سیاسیات میں ہر جگہ یہی ہو رہا ہے۔ نیز محبت اور جنگ میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے صحیح یا غلط حربے کے استعمال سے قطعاً دریغ نہیں کیا جاتا۔ چنانچہ ناظرین کی تسلی کے لئے چند ایک مثالیں پیش کروں گا۔ جن سے ان مذموم طریقوں کی بخوبی وضاحت ہو جائے گی۔ مثلاً جب انگلستان کی گورنمنٹ نے روہر Rhur پر فرانسیسی حملہ کے خلاف احتجاج کیا تو ایک ماہواری رسالہ نے لکھا کہ انگلستان نے اس لئے اعتراض کیا ہے کیونکہ اُسے خدشہ ہے کہ فرانسیسی روہر کی تجارت پر قبضہ کر لیں گے۔ حالانکہ اگر ہم احتجاج نہ کرتے تو دنیا یہ سمجھتی کہ ایک کمزور دشمن کو تباہ کرنے کے لئے ہم نے فرانسیسیوں سے سازباز کر لیا ہے۔ جب ریاستہائے متحدہ امریکہ کی ہائیکورٹ نے ہندوستانیوں کو امریکن شہری کے حقوق دیئے جانے کے خلاف فیصلہ کیا تو اس پر یہ پراپیگنڈا کیا گیا کہ چونکہ انگریز ہندوستانیوں کے خلاف بغض و کینہ رکھتے

ہیں اس لئے برٹش سفیر کے زیر اثر یہ مخالف فیصلہ صادر کیا گیا ہے ۔ یہ پراپیگنڈا بذاتہ اسی قدر مضحکہ انگیز تھا کہ ایک ہندوستانی بانی جو اس وقت امریکہ میں مقیم تھا ۔ خود ہی اس کی قرار واقعی قلعی کھول دی ۔ یعنی جب جاپانیوں کے خلاف بھی اُس عدالت نے ویسا ہی فیصلہ صادر کیا تو اُس نے اپنے ہم وطنوں کو توجہ دلاتے ہوئے یہ سوال کیا کہ یہ دوسرا فیصلہ بھی انگریزوں کے ایما سے حاصل کیا گیا ہے ۔ جب کبھی کسی درسگاہ سے ہندوستانی طالب علم ہڑتال کا مظاہرہ کرتے ہیں تو ہمیشہ یہ پراپیگنڈا کیا جاتا ہے کہ اساتذہ نے ہڑتال کو روکنے کے لئے نہایت وحشیانہ مظالم کا اظہار کیا ۔ ایسی ہڑتالوں میں عام طور پر طلبہ درسگاہ کے تمام دروازوں پر کھڑے رہتے ہیں اور اکثر اندر جانے والوں کے راستے میں لیٹ جاتے ہیں ۔ چنانچہ ایسے مواقع پر اخبارات میں عام طور پر غلط اطلاعات شائع کی جاتی ہیں ۔ یہاں تک کہ اُن عیسائی اُستادوں کے خلاف بھی پراپیگنڈا کرنے سے گریز نہیں کیا جاتا جن کی خوبیوں کے اس سے پہلے تمام معترف تھے ۔ مثلاً کلکتہ کے روزانہ اخبارات کی رپورٹوں کے مطابق ایک عیسائی مشنری پروفیسر کے خلاف یہ لکھا گیا تھا کہ جب اس کو کالج میں داخل ہونے سے روکنے کی کوشش میں بعض طلبا اس کے سامنے لیٹ گئے تو اس نے نہایت وحشیانہ طریق سے

ان طلباء کو ٹھوکریں رسید کیں اور اُن کے جسم کو روندتا ہُوا اوپر سے
زر گیا۔ ہندوستان ہی ایک ایسا ملک نہیں جس میں ہمارے خلاف
س قسم کا زہریلا پروپیگنڈا کیا جاتا ہے۔ بلکہ جرمنی اور ریاستہائے
تحدہ امریکہ کو تو خاص طور پر ہمارے خلاف کامیابی سے پروپیگنڈا
رنے کے لئے منتخب کیا گیا۔ چنانچہ جب ہم پنجاب کے مظالم کی
انی کے لئے اپنے ہموطنوں کو متوجہ کر رہے تھے ۔تاکہ ہندوستانیوں
ی مظلومیت بے نقاب ہو کر ان سے قرار واقعی سلوک کیا جا
کے تو ہمارے مقصد میں سب سے زیادہ رکاوٹ امریکہ کی بعض
اعتوں کی رضا کارانہ طور پر ہندوستان کی امداد اور ہمدردی
ے اظہار کرنے سے پیدا ہوئی۔ جو بہت حد تک مایوس کن تھی۔
س قسم کی امداد میں غالباً امریکن ہوم رُول لیگ آف انڈیا خصوصیت
ے قابلِ ذکر ہے۔ ہمارے دشمنوں نے جلیانوالہ باغ کے مقتولین
ی تعداد بھی نہایت بڑھا چڑھا کر پیش کی تھی۔ چنانچہ وُہ
صرار کے ساتھ کئی ہزاروں کی تعداد پر زور دیتے تھے۔
رچہ مجھے اُن کی صحیح تعداد اس وقت یاد نہیں۔ لیکن اس
یں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے اس خوفناک واقعہ کی اصلیت
و ماننے سے صاف انکار کر دیا یعنی یہ کہ چند منٹوں میں پندرہ
انسانوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔ ہندوستانیوں
ور اُن کے ہمدردوں کے اس طرزِ عمل نے ہندوستان کے

مقصد کو سخت نقصان پہنچایا ہے یعنی بہت سے ایسے افراد جو نہایت دیانتداری سے ہندوستان کو فائدہ پہنچانا چاہتے ہیں۔ اس قسم کے غلط پروپگنڈا سے برگشتہ خاطر ہو گئے ہیں۔ چنانچہ حکومت خوداختیاری کے حصول کے لئے ہندوستانی جس قدر امداد کی توقع ہم سے رکھتے ہیں وہ اسی برگشتگی کی نذر ہو گئی ہے جو اس بدنصیب ملک کے لئے ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔ ہمیں ہندوستانیوں کے مقصد سے محبت ہے جس کا ثبوت بھی ہم بارہا دے چکے ہیں لیکن بہت سے ایسے انگریز جو نہایت جانفشانی اور ہمدردی سے ہندوستان کو اپنے مقصد تک پہنچنے میں دیانتدارانہ امداد کرتے چلے آئے ہیں۔ اس وقت موجودہ پروپگنڈا سے متاثر ہو کر یہ محسوس کر رہے ہیں کہ انہیں بادلِ ناخواستہ امداد کے ہاتھ کو کھینچنا پڑے گا۔ کیونکہ موجودہ فضا میں ہمدردی اور محبت کی جگہ تلخی اور منافشت روز افزوں ترقی کر رہی ہے۔

اس وقت حالت یہ ہے کہ ہر جگہ ہندوستانی مرد اور عورت اپنی خودداری اور قومی وقار کی واپسی کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ اس لئے ان کو دوبارہ آزاد کر دینا چاہیئے تاکہ وہ صرف ہمارے ساتھ ہی نہیں بلکہ تمام دنیا کے ساتھ مساویانہ حیثیت میں فخر و ناز کے ساتھ آنکھیں چار کر سکیں۔ چنانچہ اس کا یہ نتیجہ ہوگا۔ کہ وہ

حالات تو پڑھیں۔ لیکن نیل نے (NEILL) اس کنوئیں تک پہنچتے پہنچتے راستے میں جو دردناک مظالم برپا کیے، وہ اُن کی آنکھوں سے پوشیدہ رکھے جائیں۔

مجھے پورا یقین ہے کہ موجودہ وقت سے بہتر فضا کبھی پیدا نہیں ہوئی۔ جب ہمارے ہموطنوں کے دلوں میں گذشتہ مظالم کی تلافی کرنے کیلیئے بے چینی اور اضطراب ظاہر نہ ہوا ہو۔ دوسری طرف ہندوستانی بھی ہمارے متعلق اپنے دلوں کی گہرائیوں میں یہ بخوبی یقین رکھتے ہیں کہ ہم اُس قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ جو نہ صرف کسی کمزور قوم پر مظالم کرکے خوش نہیں ہوا کرتی۔ بلکہ اُن مظالم کے پوشیدہ رکھنے کی مکروہ کوشش کو بھی نہایت نفرت کی نگاہ سے دیکھا کرتی ہے۔ بہرحال میری قوم کے لیئے یہ نہایت ضروری ہے کہ وہ ان واقعات کی صحیح تصویر دیکھ لے جو اس کے نام پر کیے گئے تھے اور افسانوں اور تاریخ کی شکل میں ان مظالم کی مسخ شدہ تصویر، جو اس کے اپنے لڑکوں اور ہندوستانی طلبا کے سامنے جبراً پیش کی گئی تھی، بخوبی اندازہ کرے۔

اس باب کو ختم کرنے سے پہلے اپنی قوم کو مشورہ دونگا کہ وہ غدر کی چھٹیاں وغیرہ شائع کرنے سے گریز کرے۔ کیونکہ جواب میں اسی قسم کی دستاویزیں ہندوستانی پریس کی طرف

موجودہ غلط پروپگنڈا کو چھوڑ کر آزاد انسانوں کی طرح زندگی اختیار کریں گے۔ ہندوستان کی تاریخ میں ایک نئے آفتاب کے طلوع کا انتظار ایک عرصہ سے کیا جارہا ہے۔ اس لئے ہمیں نہ تو کلکتہ کے بلیک ہول Black Hole کے حادثہ فاجعہ پر زور دینا چاہیئے اور نہ ہی ستر موپلا تیمیڈولہا کے ریل گاڑی کے اندر دم گھٹ کر مرنے کے خوفناک واقعہ سے لاپروائی کا اظہار کرنا چاہیئے .. ..

.. .. ہمیں اب کانپور کے خونی حادثہ کو تو آنکھوں سے اوجھل کر دینا چاہیئے لیکن بنارس الہ آباد اور کانپور پر رینا ڈ (Renaud) کے کوچ کے وحشیانہ مظالم تغافل اور گمنامی کی نذر نہیں کرنے چاہئیں۔ بابو رومیش چندر دت نے جس مدبرانہ انداز سے غدر کے خوفناک واقعات کے متعلق ہماری قوم سے اپیل کی ہے۔ وہ اس قدر موثر ہے کہ بے اختیار ہمارے دلوں میں ہمدردی کے جذبات موجزن ہو جاتے ہیں۔ بالخصوص اس میں ایک فقرہ تو اس قابل ہے کہ اس پر فوراً توجہ کی جائے جس میں وہ درخواست کرتا ہے کہ غدر کے واقعات کو یا تو تواریخ سے نکال دینا چاہیئے، اور اگر یہ نہ ہو سکے تو کم از کم لڑکوں کی درسی کتب سے تو ان دردناک واقعات کو بالکل علیحدہ کر دینا چاہیئے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیوں ہندوستانی طلبا کانپور کے کنوئیں کے وحشیانہ

سے بھی شایع کی جائیں گی جن کو گورنمنٹ مجبوراً ضبط شدہ قرار
دے گی۔ کیونکہ ایسی کتب کی اشاعت سے دونوں قوموں
کے درمیان نسلی منافرت اور کشیدگی زیادہ سُرعت سے
پھیلتی جائے گی ؁

باب سوم

خاتمہ یا نتیجہ

لیکن اس معاملہ کو یہیں تک چھوڑنے سے میرا اطمینان نہیں ہوتا کیونکہ بعض ایسی باتیں ابھی باقی ہیں جن کو مختصر الفاظ میں یہاں پر بیان کرنا نہایت ضروری ہے اوّل یہ کہ ایل کارتھیل۔ (AL - CARTHILL) نے اپنے ایک بیان میں لکھا ہے کہ "گورنمنٹ کی قتل و خونریزی سے ہندوستانیوں کے دلوں میں کوئی خاص نفرت پیدا نہیں ہوا کرتی"۔ اس عیار اور بے فکر مصنف کی بعض تحریرات میں اس قسم کے جملے اکثر ایسے مل جاتے ہیں۔ جو تقریباً صحیح اور درست ہوتے ہیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے مغلوں کے بعد ویسے ہی خوفناک مظالم پر کاربند رہنا پسند کیا۔ سوائے اس فرق کے کہ مغلوں کے وقت میں مجرمین کو یا

تو گرم سلاخوں سے داغا جاتا تھا، یا زندہ کھال اُتاری جاتی تھی ۔ مگر انگریزوں نے ہلاکت کے مختلف طریقے اختیار کئے لیکن دونوں حکومتوں کے اندر اُن اضلاع کو جہاں پر بغاوت رونما ہوتی تھی ۔ نہایت بے دردی سے ویران کیا جاتا تھا ۔ اور اُن کے دیہات اور فصلوں کو آگ لگا کر خاکستر کر دیا جاتا تھا ۔ اِن دونوں میں صرف اتنا فرق ہے کہ مغلوں کی حکومت کو ختم ہوئے دو سو سال کا زمانہ گذر چکا ہے ۔ لیکن غدر کو واقع ہوئے ابھی ستر سال کی مدت ہوئی ہے ۔ ہندوستان پر برٹش قبضہ کا یہ زمانہ یورپ کے پانچسو سال پہلے کے زمانہ سے مناسبت رکھتا ہے ۔ چونکہ متقدمین کے حالات میں ایک قسم کی یکسانیت موجود ہوتی ہے ۔ اسی لئے اپنے خیالات اور اپنے اسلاف کے خیالات میں آج ایک بیّن اختلاف نظر آتا ہے ۔ چنانچہ مسٹر کوون COWAN نے جو خونریزی ۱۸۷۲ء میں روا رکھی تھی ۔ اس نے موجودہ ہندوستانیوں اور بعض انگریزوں کو آتش زیر پا کر دیا لیکن ۱۸۷۲ء میں اسی قسم کے مظالم اُس وقت کے باشندوں میں اس حد تک بے چینی پیدا نہ کر سکے ۔ مزید برآں جس نفرت اور ناراضگی کا اظہار موجودہ ہندوستانی ہمارے خلاف ظاہر کر رہا ہے وہ ستر سال پہلے کے ہندوستانی دماغ کے نقطۂ نظر سے نہیں کیا جا رہا بلکہ ہمارے بے بہا علم و ادب اور تواریخ سے استفادہ حاصل کر کے موجودہ

فضا کے زیر اثر ایسا ہو رہا ہے۔ یہانتک کہ آج ہمارے افعال کو ہمارے ہی سکھلائے ہوئے معیار سے پرکھا جاتا ہے مگر مغلوں کے مظالم کو نہائت لاپروائی سے ایک وحشت و بربریت کے زمانہ کی یادگار کہہ کر ٹھکرا دیا جاتا ہے جو آج کل معدوم ہو چکا ہے۔

ہمیں بلا شبہ اس زہریلے کنوئیں کو پاٹ دینا چاہئے اور خوش قسمتی سے اس وقت ایک کثیر تعداد ایسے ہندوستانیوں اور انگریزوں کی موجود ہے جو نہائت دیانتداری سے یہ خواہش رکھتی ہے کہ کسی طرح غدر کے رنجدہ واقعات کی یاد کو ہمیشہ کے لئے تاریخ کے صفحات اور انسانوں کے قلوب سے محو کر دیا جائے۔ تاکہ دونوں اقوام کے فطری پیار اور اخوّت کے مراسم آزادانہ طور سے ایک دوسرے پر اثر ڈال سکیں۔ چنانچہ ایک انگریز افسر لکھتا ہے کہ:۔

"ہندوستان اور انگلستان کے مفاد کا اقتضا یہ ہے۔ کہ اس ظالم بغاوت کی تلخ یاد کو فراموش کر دیا جائے" لیکن یہ اُسی صورت میں ہو سکتا ہے اگر دونوں طرف سے فراموش کرنے کے لئے سرگرمی سے کوشش کی جائے۔ مثال کے لئے لاہور میں لارڈ لارنس (Lawrance) کے بدنام بُت کو لے لیجئے جس کی حفاظت کے لئے اب گورنمنٹ کو مسلّح پہرہ متعیّن کرنا پڑتا ہے۔

"جان لارنس John Lawrence کے بُت سے سنگتراش نے اس کیفیت کو ظاہر کیا ہے کہ وہ زبانِ حال سے ہندوستانیوں

کو حکم دے رہا ہے کہ یا تو خوشی سے ہماری غلامی اختیار کرو ورنہ جبراً تمہیں اپنا غلام بنا لیا جائے گا۔ چنانچہ بُت کے نیچے ذیل کے الفاظ کندہ ہیں: "تم کس کی حکومت کے خواہاں ہو۔ قلم کی یا تلوار کی؟" (By wich will ye be governed - the pen or the sword) - اور گو قلم کے ذریعہ ہی حکومت کی گئی - لیکن اس کے باوجود تلوار کو ضرورت کے وقت استعمال کرنے کے لئے صرف میان میں چھپا لیا گیا تھا"

لیکن جب تک ایسی نشانیاں موجود ہیں۔ ناممکن ہے کہ ہندوستانیوں کے دل ہماری طرف سے صاف ہوں۔ چنانچہ ایسی ہی علامات دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ کس طرح برطانیہ کے نام پر اس قسم کی حرکات کو صحیح اور جائز سمجھا گیا۔

چونکہ ہندوستانی بھی اپنے آپ کو دنیا کی برادری میں شامل کر رہا ہے۔ اس لئے غدر کی تاریخ اس کے نزدیک اب صرف انگریزوں اور ہندوستانیوں کی سرگزشت کی حیثیت نہیں رکھتی۔ بلکہ وہ یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ اُس وقت کے زمانہ میں دنیا کی مظلوم قوموں کی طرح وہ بھی ایک مظلوم کی حیثیت میں ستم اُٹھاتے رہے۔ چنانچہ اُس زمانہ کی لغاوتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اس امر پر حیرت کا اظہار نہیں کرنا چاہیئے کہ طرفین نے اس قسم کی وحشیانہ سنگدلی کا مظاہرہ کیا بلکہ ہمارے لئے تو فخر اس میں ہے کہ ہم نے باغیوں کو

غلام و نامراد رکھا۔ وہ زمانہ ہی ایسا تھا جبکہ لڑائیوں میں بے انتہا سفاکی اور سنگدلی کا اظہار کیا جاتا تھا۔ چنانچہ اسی زمانہ میں آسٹریا (Austeria) نے ہنگری کے باشندوں (Hungarians) کو اور روس نے پولینڈ والوں کو بیدریغ پھانسیوں پر لٹکایا۔ جب سپین (Spain) میں کارلسٹس Carlists اور اُس کے دشمنوں نے ایک دوسرے پر گولی چلائی اور پھانسیاں دیں۔ یہی وہ زمانہ تھا جب پیرس میں خانہ جنگی نہایت زور شور سے ہوئی اور طرفین نے نہایت سفاکی اور بربریت سے ایک دوسرے کا خون گرایا۔ چنانچہ اب اگر ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ ہم ایک شریف کرۂ ہوائی میں سانس لے رہے ہیں تو ہندوستانیوں کو اور ہمیں بالاتفاق یہ اعلان کر دینا چاہیئے کہ جو افعال اور مظالم ہماری پیدائش سے پہلے عمل میں لائے گئے۔ ہم قطعاً ان کے ذمہ دار نہیں ہو سکتے۔ جس طرح قوموں کے مناقشات اور اختلافات کو اخلاق کے مختلف اصولوں پر پرکھا جاتا ہے۔ اسی طرح ہندوستانی غدر کے حالات کو بھی اسی معیار پر پرکھنے کی کوشش کی گئی۔ باوجود اس امر کے کہ ہم بعض دفعہ اس سے انکار کر دیتے ہیں لیکن حقیقت یہی ہے کہ ہم ایک فوجی قوم ہیں اور ایک فوجی قوم کے نزدیک بغاوت سے زیادہ سنگین اور کوئی جرم نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ فوجی قانون کی رُو سے بغاوت کے اعلان کے بعد ہی ایک باغی اپنے

زندہ رہنے کے استحقاق کو فی الفور کھو دیتا ہے۔ اگرچہ اس سے پیشتر وہ کتنا ہی مظلوم کیوں نہ رہا ہو۔ لیکن یہ بھی صحیح ہے۔ کہ ایک سوسائٹی کے وضع کردہ قوانین دوسری قوم کے لئے قابل قبول نہیں ہوا کرتے۔ بلکہ بعض حالات میں تو قومیں ایک دوسرے کے قوانین سے بھی بے خبر ہوا کرتی ہیں۔ چنانچہ ایک بادشاہ اور فلسفی پر بغاوت کا اعلان ویسا ہی متضاد اثر پیدا کرتا ہے۔ جیسا کہ الحاد کے دعویٰ سے ایک جویائے حق اور ایک سائنسدان کے دماغوں پر مختلف اثر ہوتا ہے۔ انسانوں نے نہایت دیانت داری اور خلوص سے اپنے جیسے مخلص اور سچے آدمیوں کو سچائی اور مذہب کے نام پر نہایت بیدردی سے موت کے گھاٹ اتارا ہم اپنے ضمیر کی رہنمائی کے باوجود یہ کبھی نہیں کہہ سکتے کہ جس طرز عمل کو ہم نے اختیار کیا تھا، وہی صحیح تھا۔ مگر ہمارے دشمن کا اختیار کردہ راستہ غلط اور گمراہ کن تھا۔

میں اپنے ہم مذہب عیسائی دوستوں کو خصوصیت سے توجہ دلاؤنگا۔ کہ وہ اس معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لیں اور اس امر کی پوری کوشش کریں کہ ہندوستان کے معاملہ میں ہمارے نقطۂ نظر میں نمایاں تبدیلی پیدا ہو جائے۔ اُن کی خدمت میں ایک ایسی بات کہوں گا جو کسی عیسائی کانفرنس یا مشنری پلیٹ فارم سے اب تک اُن کے گوش گذار نہیں ہوئی ہو گی۔ یعنی تعلیمیافتہ ہندوستانی نے عیسائیت

سے اب تک انحراف اس لئے نہیں کیا کہ وُہ ذات پات کا بہت پابند ہے یا مفروضہ قومیت مانع ہے یا برہمن کہلانے کا فخر درمیان میں حارج ہے بلکہ عام طور پر ان کا یہ عقیدہ بن گیا ہے کہ سچائی کے مقابلے میں عیسائی گرجے محض رسمی تربیت اور تعلیم کا مظہر رہ گئے ہیں۔ نیز ایک غلطی یا ظلم کی تلافی کے مقابلہ میں عیسائی مبلّغین "روحانی ترقی" کی طرف زیادہ توجہ دیتے ہیں حالانکہ انجیل مقدس کی تعلیم کے مطابق اُن کا فرض صرف روحانی ترقی کی تعلیم و تبلیغ ہی نہیں ہے۔ بلکہ سچائی اور مظلوموں اور کمزوروں کے حق میں بیباکانہ احتجاج کرنا بھی ہے۔

عیسائیت کی تعلیم کے مطابق "کفّارہ" کی آواز آج ہر ہندوستانی کے لبوں سے نکل رہی ہے۔ وُہ بہ بانگ دہل اس کا مطالبہ کرتے ہیں کہ انگلستان نے آج تک اپنے گذشتہ مظالم کا کفارہ ادا نہیں کیا۔ اس لئے جب تک وُہ قرار واقعی ادائیگی نہ کرلے گا۔ اس وقت تک ہم اُس کے دوست نہیں بن سکتے۔ اُن کے ذہن میں سنسکرت کا لفظ "پرائسچت" ہر وقت موجود رہتا ہے۔ جس کے لغوی معنے "کفارہ" کے ہیں اور اس سے مراد ایسی حرکت ہے جس سے یہ اطمینان ہوجائے کہ واقعی ہمیں گذشتہ واقعات پر افسوس ہے اور آئندہ کے لئے ہم وعدہ کرتے ہیں کہ ایسے رنجدہ واقعات دوبارہ ظہور پذیر نہیں ہوں گے۔ چنانچہ حکومت

خود اختیاری کے حصول کیلئے وہ اس حد تک مضطرب نہیں ہیں جتنے کہ وہ اس قسم کی فیاضانہ حرکت دیکھنے کے متلاشی ہیں جس میں اُنہیں اطمینان ہو جائے کہ دنیا کی ایک بہت بڑی قوم اپنی گذشتہ تاریخ پر متاسف ہے اور آئندہ کے لئے اطمینان دلاتی ہے کہ وہ غلطیوں کی اصلاح کیلئے ہمیشہ مستعد رہے گی۔ نیز واقعات میں غلط بیانی کرنے کو ہمیشہ اپنی حیثیت سے گرا ہوا متصور کیا کرے گی۔

لیکن اختتام کے موقع پر یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ آج سے ستر سال پہلے دونوں قومیں ایک نہائت ہی قاتلانہ دیوانگی کا شکار رہ چکی ہیں۔ ہم نہ تو اب اُن خوفناک لڑائیوں کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں اور نہ ہی اُن مکروہ حرکات کو عمل میں لانا چاہتے ہیں۔ جن میں ہم ذاتی طور پر شریک بھی نہیں تھے۔ علاوہ ازیں اس وقت یہ امر بھی زیر بحث نہیں کہ اگر اس وقت ہم شریک ہوتے تو کیا اُسی دیوانگی کے ماتحت ہم بھی ویسے ہی وحشیانہ مظالم کے علمبردار ہوتے۔ کیونکہ ہمارے متعلق بھی یہ ویسا ہی صحیح ہے جیسا کہ اس سے پہلے مکروہ افعال کئے گئے تھے۔ یعنی جناب مسیح کو سُولی پر لٹکا دیا گیا۔ یا جون آف آرک (Joan of arc) کو زندہ آگ میں جلا دیا گیا۔ یا اسی قسم کے اور بیشمار سنگدلانہ افعال جو مورخ کی نظر سے اوجھل رہے۔ البتہ ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم ایسے مظالم کی تصدیق کرنے سے صاف انکار کر دیں اور

دنیا میں اپنی معروضہ قومی عزت کے تحفظ کیلئے ایسے وا
غلط اشاعت سے پرہیز کریں۔ موجودہ زمانہ گنہگار مرد و
بھرا پڑا ہے جو اپنے لئے نسل اور وطن کے انتخاب میں
ہیں اس لئے زیادہ جو ہم کر سکتے ہیں وہ یہی ہے کہ بزد
رذالت کے اظہار کی جگہ ہمارے طرز عمل میں فیاضی اور
کی نمائش ہو۔ یعنی ہم میں سے ہر برطانی الاصل کا یہ فرض
کہ وہ اپنی تواریخ سے جھوٹ اور غلط بیانی کے تمام عنصر کو
کیلئے بالکل علیحدہ کر دے تاکہ ایک ایسی نئی فضا پیدا ہو ج
میں ایک نئے خیال کی دنیا کی نشو و ارتقا ممکن ہو سکے۔

ناظرین میں سے بہت سے اصحاب نے اگرچہ دہشت
کے مشترکہ احساس سے میری کتاب کو پڑھا ہوگا۔ لیکن بالآ
نے ایک قسم کی طمانیت ضرور محسوس کی ہوگی۔ کیونکہ وحش
بربریت کا جو خیالی دیو برطانوی قلوب کو آج تک پریشان
تھا اس کا اثر میری کتاب کے مطالعہ سے جاتا رہا۔ ہم ا
کی دیوانگی کو تو سمجھ سکتے ہیں۔ جس میں ہمیں اس حد تک
نہیں ہوتی جتنی کہ شرم محسوس ہوتی ہے۔

لیکن اس کے مقابلے میں ہندوستانی قوم کی دیوانگی
بعید از قیاس نہیں ہے جو سمجھ میں نہ آ سکے۔ کیونکہ مسل
اور تکالیف اٹھاتے ہوئے اس کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا۔ ا

اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکی - اندریں حالات میرا تو یہ عقیدہ
ہے کہ ایسے افراد سے سمجھوتہ بھی ہو سکتا ہے اور دوستی کا پیمان
بھی باندھا جا سکتا ہے بلکہ میرے نزدیک ہندوستانیوں کی جدوجہد
کے پیچھے اسی مقصد کے حصول کا جذبہ کام کر رہا ہے ۔

عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور میں باہتمام حافظ محمد عالم پرنٹر چھپوا کر شائع کیا